بنیادی حقیقتیں

کوثر نیازی

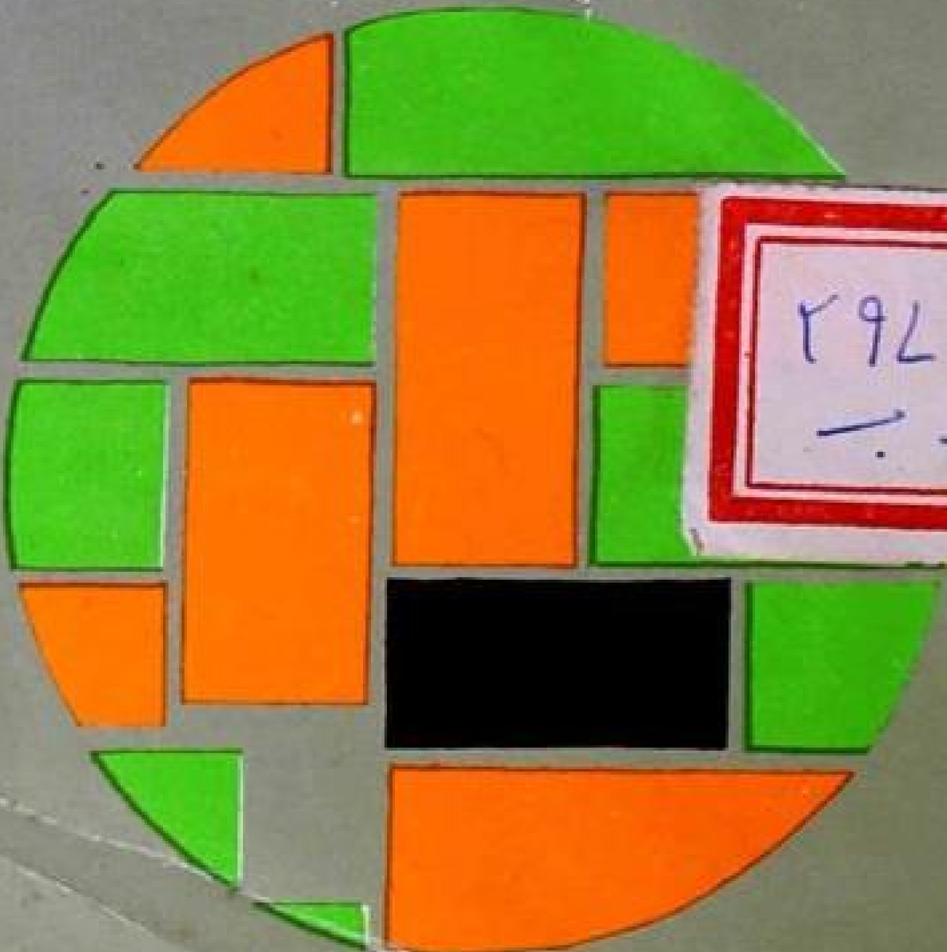

۲۹۷۸۱
ک ۔ ب

اِسلام یُوں تو ایک بحرِ ذخّار ہے ، اس میں ہزاروں سمُندروں اور قلزموں کی وسعتیں بند ہیں مگر ان ساری وسعتوں کے باوجُود اس کی بُنیادی حقیقتیں صِرف چند ہیں اور جو مُسلمان ان بُنیادی حقیقتوں کو سمجھ لیتا ہے وہ اِسلام کی ساری وسعتوں کو اپنی نظر میں بھی اور اپنے قلب میں بھی سمو لیتا ہے۔

مولٰینا کوثر نیازی بچپن سے لے کر جوانی تک اور جوانی سے لے کر اِس وقت تک جب کہ وہ عوامی حکُومت میں ایک وزیر ہیں ، اِسلام کے سچّے اور مُخلص مُبلّغ رہے ہیں۔ یہ مُختصر کتاب لکھ کر اُنھوں نے اِسلام کی تبلیغ کا حق پُوری طرح ادا کر دیا ہے اور اسلام کے مُتعلق ضروری حقائق ، عوام کے سامنے مُختصر سے مُختصر الفاظ میں پیش کر کے اپنی عاقبت بھی سنوار لی ہے اور ساتھیوں کو بھی اس ضروری سفر کا زادِ راہ مہیّا کر دیا ہے۔

کتاب گو مُختصر ہے مگر اسے پڑھنے کے بعد اِسلام کا سارا مرکزی تصوُّر اور اس کے ضروری اضلاع قلب و نظر کی اس طرح زینت بن جاتے ہیں کہ کوئی تشنگی باقی نہیں رہتی اور یہ مولٰینا کا اِعجاز ہے یا اِسلام سے بے پناہ خلُوص کا نتیجہ۔

۵۲۸۹۶

بُنیادی حقیقتیں

کوثر نیازی

فیروز سنز لمیٹڈ

لاہور ـــــ راولپنڈی ـــــ کراچی

٥٢٤٨
٢٩٢٥١

تیسری بار 1973ء
تعداد 500
قیمت 6.50 روپے

مطبوعہ فیروز سنز لمیٹڈ لاہور باہتمام عبدالحمید خان پرنٹر پبلشرز

ترتیب

توحید

1	ہر نبی توحید کا داعی تھا	9
2	عقیدۂ توحید عقل کے خلاف نہیں	12
3	توحید کا عقلی ثبوت	15
4	توحید کی ایک اور دلیل	18
5	خدائے واحد کی صفات	20
6	اللہ پر ایمان کا پہلا تقاضا	22
7	خدا کی محبت	24
8	خدا کی محبت کا صحیح تصور	26
9	توحید پر استقامت	28
10	توحید کی نشر و اشاعت	31
11	انسانی زندگی پر توحید کے اثرات	34
12	ایک خدا، ایک انسان اور ایک نظام	40

رسالت 43

1	سیدھی راہ کی سمت راہنمائی	45
2	رسالت کی ضرورت	47
3	سلامتی کا راستہ	50
4	انبیاء کی صداقت	52
5	امام غزالی کا استدلال	54
6	انبیاء کا منصب	56
7	انبیاء آدمی تھے	58
8	شرطِ نجات	61
9	حضورؐ پر ایمان ضروری ہے	63
10	حضورؐ امراضِ رُوح کے سب سے بڑے معالج تھے	66
11	اِنسانیت کا سہارا	68
12	سب سے بڑا مُعجزہ	71
13	حضورؐ کا اُسوۂ حسنہ	78
14	حضورؐ کی امتیازی حیثیت	82
15	اطاعتِ رسُولؐ	87
16	محبتِ رسولؐ	93
17	سُنّتِ رسُولؐ	98
18	تدوینِ حدیث	104
19	ختمِ نبوّت	114

	آخرت	119
1	عقیدۂ آخرت	121
2	عقیدۂ آخرت کی اہمیت	125
3	اشکالات کا بنیادی حل	127
4	سائنس اور عقیدۂ آخرت	129
5	خسارے میں کون ہے؟	132
6	آخرت کے چند مناظر — قرآن میں	135
7	آخرت کے چند مناظر — حدیث میں	139
8	سلف صالحین اور خوفِ آخرت	141
9	دنیا و آخرت میں باہمی تعلق	145
10	کتابیات	150

پہلا باب

توحید

نقطۂ ادوارِ عالم لاالٰہ

انتہائے کارِ عالم لاالٰہ

چرخ را از زورِ اُو گردندگی

مہر را پایندگی رخشندگی

بحر، گوہر آفرید از تابِ اُو

مُوج در دریا تپید از تابِ اُو

فصل ۱

ہر نبی توحید کا داعی تھا

دنیا میں خاتم الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک جتنے بھی انبیاء تشریف لائے ہیں، انھوں نے سب سے پہلے انسانوں کو جس بات کی طرف دعوت دی وہ یہ تھی کہ۔

اَنْ لَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِیَّاہُ — اس مالک حقیقی کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔

آسمانی تعلیمات کا یہ وہ بنیادی نکتہ ہے جسے ہر نبی اور رسول کے پیغام میں اصل الاصول کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو جب جیل میں تبلیغ دین کا موقع ملا تو جیل کے ساتھیوں کو انھوں نے سب سے پہلے جو حیات افروز سبق دیا وہ یہ تھا۔

یَا صَاحِبَیِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰہُ الْوَاحِدُ الْقَھَّارُ۔

اے میرے جیل کے ساتھیو! کیا یہ مختلف اور متعدد جھوٹے خدا اس اکیلے طاقت والے خدا سے بہتر ہو سکتے ہیں۔

حضرت شعیبؑ اور حضرت ہودؑ نے قوم کو پکارا تو ان کی سب سے پہلی پکار یہ تھی یَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ حضرت نوحؑ مبعوث ہوئے تو ان کا اولین

پیغام یہ تھا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ وَاتَّقُوْہُ وَاَطِیْعُوْنِ اسی کی بندگی کا خوف اور اسی کی اطاعت " یہ وہ لازوال حقیقت تھی جسے اجاگر کرنے کے لیے انبیاءِ کرام کی بعثت ہوئی۔

اور یہ وہ لازوال حقیقت ہے جو آدمی کی فطرت میں ودیعت کردی گئی ہے۔ معدودے چند افراد کے سوا ہر دور میں خدا کا تصور اکثریت کا عقیدہ رہا ہے۔ دنیا بہت کچھ بھولتی رہی۔ شرافت بھول گئی۔ شرم و حیا فراموش کر بیٹھی۔ انسانیت کا بنیادی جوہر ہاتھ سے دے بیٹھی لیکن خدا کا خیال اور خدا کا اعتماد اس کے دل و دماغ سے محو نہ ہوسکا۔ یہ صحیح ہے کہ منکرین اور ملحدین بھی ہر زمانہ میں نظر آتے ہیں لیکن توحید کو اس کے باوجود فطرت کی لازوال حقیقت اس لیے کہا جاتا ہے کہ چند سر پھرے لوگوں کے انکار کی وجہ سے سورج کی طرح یہ چمکتی ہوئی سچائی جھوٹ میں تبدیل نہیں ہوسکتی۔ چند بیمار اگر اپنے منہ کی کڑواہٹ اور ذائقہ کی خرابی کے باعث ایک لذیذ کھانے کو بدمزہ سمجھنے لگیں تو ہم کھانے کی لذت کا انکار کرنے کی بجائے ان کو بیمار سمجھ کر درخورِ اعتناء نہیں سمجھیں گے بعینہ اسی طرح آج یا آج کی طرح ہر دور کے روحانی بیمار اگر خدا کے وجود کا انکار کرتے ہیں تو یہ بات خود ان کے بطلان کی دلیل ہے اس سے عقیدۂ توحید کی صداقت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔

یہ بات کہ توحید انسانی فطرت کی آواز ہے قرآنِ حکیم کے بیان کردہ اس واقعہ سے بھی ثابت ہوتی ہے کہ روزِ ازل جب انسان کی تخلیق ہوئی تو سب سے پہلا جو سوال نسلِ انسانی سے کیا گیا وہ یہ تھا کہ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں۔ قَالُوْا بَلٰی شَہِدْنَا انھوں نے جواب دیا بے شک ہے ہم گواہی دیتے ہیں۔

قرآنِ کریم آگے چل کر بیان کرتا ہے کہ یہ اقرار بنی نوع انسان سے اس لیے کرایا گیا کہ کہیں آگے چل کر وہ یہ عذر نہ کرے کہ اس حقیقت کی اسے خبر نہیں تھی۔

یہ ہے توحید کا عظیم الشان عقیدہ جس کا اقرار ہمارے خمیر میں شامل ہے جسے تمام انبیاء نے فطرت کا نقیب ہونے کی حیثیت سے اپنے اپنے عہد میں تازہ کیا جس کے لیے

روزِ ازل ہم نے اپنے مالکِ حقیقی سے پیمانِ وفا باندھا۔

کتنی دردناک ہے یہ بات، کہ آج زمانہ پھر فطرت کی اس لازوال حقیقت سے صرفِ نظر کر کے تباہی کو دعوت دے رہا ہے، اور ہم مسلمان جو

"توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے"

کا نعرہ بلند کرنے والے تھے۔ آج خود توحیدِ حقیقی کا دامن ہاتھ سے چھوڑے دے رہے ہیں۔

فطرت کا وہ پیمانِ وفا یاد نہیں ہے
فریاد کہ دنیا کو خدا یاد نہیں ہے

فصل ۲

عقیدۂ توحید عقل کے خلاف نہیں

توحید کی بات کی جائے تو ایک فلسفہ زدہ ذہن کے اندر معاً یہ سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ آخر ایک ایسی ہستی کو کس طرح تسلیم کر لیا جائے جس کے متعلق مذہب کا ادعا یہ ہے کہ وہ ازل سے ہے اور ابد تک قائم رہے گی۔ انسان کے دماغ میں جب کبھی پیدا ہو جائے تو وہ عقیدۂ توحید کو خلافِ عقل ٹھہرا کر ٹھکرانے پر تیار ہو جاتا ہے۔ امامِ ربانی مجددِ الفِ ثانی نے اسی شیطانی وسوسہ کو دور کرنے کے لیے ایک بڑا حکیمانہ نکتہ ارشاد فرمایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عقیدۂ توحید خلافِ عقل نہیں بلکہ ما فوق العقل ہے۔ اصل یہ ہے کہ یہ حقیقت انسانی عقل اور تخیل کی زد سے باہر اور اس سے وراء الوراء ہے۔ ایک حیوان کو اگر یہ معلوم ہو کہ انسان فضا میں اڑتا اور ہوا میں پرواز کرتا ہے تو یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔ لیکن اگر وہ محض اس بنا پر کہ یہ امرِ واقعہ اس کی حدودِ عقل سے باہر ہے اسے جھٹلانے پر اور اسے خلافِ عقل قرار دینے پر تیار ہو جائے تو ہم یہ کہہ کر آگے گزر جائیں گے کہ دراصل

یہ بات اس بے چارے کی عقل میں سما ہی نہیں سکتی۔ خود انسانی ایجادات کا معاملہ لے لیجیے۔ آج سے دو سو سال پہلے جو چیزیں ناممکنات کے زمرہ میں شامل تھیں، آج انھیں وقوع پذیر ہوتا دیکھ کر ہمیں کوئی حیرت نہیں ہوتی۔ لیکن فرض کیجیے اگر آج سے ایک دو صدی پیشتر لوگوں کو یہ بتایا جاتا کہ ایک ذرّے میں اتنی طاقت ہے کہ اس سے بارہ میل مربع رقبہ کے ایک شہر کو آناً فاناً تباہ و برباد کیا جا سکتا ہے۔ دس ہزار اشخاص فوراً بخارات میں تبدیل ہو سکتے ہیں اور ایک لاکھ چھبیس ہزار افراد اس کے دھماکوں سے لقمۂ اجل ہو سکتے ہیں تو ان کا ردِ عمل کیا ہوتا۔ وہ یہی تو کہتے کہ یہ بات عقل کے خلاف ہے اور ہم اسے تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں لیکن کیا ان کے اس قول کی بنا پر ایٹم بم کی تباہ کاریوں اور ہلاکت خیزیوں سے انکار کیا جا سکتا ہے اور کوئی کہہ سکتا ہے کہ ایٹم کی یہ طاقت خلافِ عقل اور خلافِ علم و دانش ہے۔ خود اس دنیا میں جو واقعات روزمرہ ہمارے مشاہدہ میں آتے ہیں اور جن پر غور کرنے کی کبھی ہم نے ضرورت محسوس نہیں کی۔ تھوڑی دیر کے لیے فرض کر لیجیے کہ وہ ہمارے مشاہدے میں نہ آتے اور ہم سے ان کا ذکر کیا جاتا تو ہمارا ردِ عمل کیا ہوتا۔ مثال کے طور پر درخت اُگنے کا منظر ہمارے سامنے نہ ہوتا اور کوئی ہم سے یہ کہتا کہ ایک ننھا سا بیج زمین میں ڈال دیا جائے تو چند دنوں کے بعد وہ بیج زمین کا سینہ چیر کر ہیئت تبدیل کر کے باہر نکل آتا ہے پھر ایک تناور درخت کی شکل اختیار کرتا ہے۔ پھل دیتا ہے۔ اس کی لکڑی جلانے کے کام آتی ہے اور لوگ اس کے سائے میں بیٹھ کر سستاتے ہیں تو ہم کیا سوچتے؟ یہی نا کہ یہ سب، باتیں بے عقلی کی ہیں اور ہم اسے ماننے کے لیے تیار نہیں، لیکن کیا ہمارے اس طرزِ عمل سے نفسِ واقعہ کو جھٹلایا جا سکتا ہے؟ پس حقیقت یہ ہے کہ جو باتیں، نادان عقل کے دائرۂ کار ہی سے باہر ہیں ان کے متعلق جھٹ خلافِ عقل بات ہونے کا فتویٰ صادر کر دینا خود بے عقلی کی دلیل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے

سب سے بڑے حکیم اور عاقل انسان نے ہمیں یہی حکم دیا ہے کہ ہم توحید کے مسئلہ کو عقلی موشگافیوں سے بلند اور بالا سمجھیں۔ حضورؐ نے فرمایا حضرت ابو ہریرہؓ اس کے راوی ہیں:

"یَاْتِی الشَّیْطَانُ اَحَدَکُمْ نَیَقُوْلُ مَنْ خَلَقَ کَذَا اَمَنْ خَلَقَ کَذَا۔ حَتّٰی یَقُوْلَ مَنْ خَلَقَ رَبَّکَ فَاِذَا اَبَلَغَ ذٰلِکَ فَلْیَسْتَعِذْ بِاللّٰہِ وَلْیَنْتَقِہٖ۔"

"شیطان تمھارے پاس آتا ہے اور کہتا ہے یہ چیز کس نے پیدا کی یا یہ چیز کس نے بنائی؟ یہاں تک کہ کہتا ہے اچھا تو تمھارے پروردگار کو کس نے پیدا کیا؟ جب یہاں تک نوبت پہنچے تو خدا کی پناہ لینا چاہیے اور اس کے ساتھ سوال و جواب کا سلسلہ ختم کر دینا چاہیے۔"

اسی لیے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا

"پاک ہے وہ ذات جس نے مخلوق کے لیے اپنی پہچان کا راستہ اس کے سوا اور کچھ بنایا ہی نہیں کہ لوگ اس کی معرفت سے عاجز ہیں۔"

اکبر الٰہ آبادی کا ایک شعر ہے۔

تُو دل میں تو آتا ہے نظر میں نہیں آتا
میں جان گیا بس تری پہچان یہی ہے

فصل ۳

توحید کا عقلی ثبوت

عقل سے اگر ان حدود کے اندر رہ کر رہنمائی حاصل کی جائے جو فاطرِ کائنات نے اس کے لیے مقرر کر دیے ہیں تو کوئی پیچیدگی پیدا نہیں ہوتی اور آدمی خود عقل کی روشنی میں صاف صاف اس نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے کہ توحیدِ الوہیت کا عقیدہ فی الواقع فطرتِ انسانی کی آواز ہے۔ یہی وہ پابندِ حدود عقل تھی جو حضرت ابنِ عباسؓ نے برتی تو اس نے انھیں اس نتیجے پر پہنچایا کہ مخلوقات کا سلسلہ ضرور کہیں نہ کہیں جا کر خالق پر ختم ہونا چاہیے۔ پھر جس سے پہلے اور جس کے بعد کوئی نہ ہو وہی اول و آخر خدا کی ذات ہے اس کے لیے پھر خالق کا تصور کرنا موجبِ تسلسل ہے اور عقل میں یہ تسلسل واضح طور پر عقل کے خلاف ہے۔[1]

حقیقت یہ ہے کہ عقل صحیح معنوں میں جِلا ہی تب پاتی ہے جب وہ اپنے عجز اور

---

[1] ترجمان السنۃ جلد اول

درماندگی کا اعتراف کر کے اس خدائے بزرگ و برتر کے آگے سپر ڈال دے جو عقلِ بے مایہ کی ہر پرواز کی زد سے باہر ہے۔ اقبال مرحوم نے خوب کہا۔

درجہانِ کیف و کم گردید عقل
پے بہ منزل برداز توحید عقل

ورنہ ایں بے چارہ را منزل کجاست
کشتیٔ ادراک را ساحل کجاست

یوں عقل جب اپنا دائرۂ عمل مشخص کر کے سرگرمِ تفکر ہوتی ہے تو اسے کائنات کا ذرہ ذرہ زبانِ حال سے توحید کی شہادت دیتا نظر آتا ہے۔ حضرت امام شافعیؒ سے ایک ملحد نے سوال کیا کہ خدا کے وجود کی دلیل کیا ہے، انھوں نے فرمایا یہ سامنے والا شہتوت کا درخت، وہ حیران ہو کر بولا کس طرح؟ حضرت امامؒ نے کہا اس کے پتے دیکھو بظاہر کتنے حقیر نظر آتے ہیں لیکن ان کی گوناگوں خاصیتوں پر نگاہ ڈالی جائے تو انسان ورطۂ حیرت میں ڈوب جاتا ہے۔ ان پتوں کو ہرن کھاتا ہے تو یہ مُشک بن جاتے ہیں۔ مکھی کھاتی ہے تو شہد بن جاتے ہیں۔ کیڑا کھاتا ہے تو ریشم بن جاتے ہیں اور انہی پتوں کو جب بکری کھاتی ہے تو یہ مینگنیوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ کیا یہ بات عقل میں آتی ہے کہ ان حقیر پتوں میں یہ متنوع خصوصیات آپ سے آپ آگئی ہیں اور کوئی ان کا پیدا کرنے والا نہیں؟

سبحان اللہ! حضرت امام شافعیؒ نے توحید کے مسئلہ پر غور کرنے کے لیے کیا خوب صورت رستہ تجویز کر دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انسان اگر حیرت کدۂ کائنات کے اسرار و غوامض کا تصور کرے تو اس کی عقل بے اختیار پروردگارِ عالم کے حضور سر بسجود ہو جاتی ہے۔ لوگ سائنس دانوں کی عقلیت کا دم بھرتے ہیں تو ذرا انہی سے دریافت کر لیں کہ اس کائنات کی بوقلمونیوں کا عالم کیا ہے؟ سائنس ہی نے بتایا ہے کہ یہ زمین جس کے گوشے گوشے کو چاند اور سورج اپنی روشنی سے منور کر دیتے ہیں ہم سے علی الترتیب دو لاکھ چالیس ہزار اور ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل دور ہیں۔ ایسے تارے

بھی موجود ہیں جن کی روشنی اس ظلمت کدۂ عالم میں سوا چار سال میں پہنچتی ہے۔ حالانکہ روشنی کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ ہے۔ یہ ان ستاروں کا حال ہے جو سورج اور چاند کے بعد ہم سے سب سے زیادہ قریب ہیں سائنس بتاتی ہے کہ بعض ستارے ایسے بھی ہیں جن کی روشنی کہیں کروڑوں سال کے بعد دنیا تک پہنچ پائی ہے۔ اور کتنے ستارے ایسے ہیں جن کی روشنی آج تک دنیا میں پہنچ ہی نہیں سکی۔ حالانکہ وہ اس وقت سے سرگرم سفر ہیں جب سے یہ کائنات وجود میں آئی ہے ــــ یہ وسیع و عریض کارخانۂ قدرت جب انسان کے سامنے آتا ہے تو اس کا سر بے اختیار خدائے واحد کی کبریائی کے آگے جھک جاتا ہے۔ اور اس کا دل بے ساختہ پکار اٹھتا ہے۔ تَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ۔

فصل ۴

توحید کی ایک اور دلیل

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے ایک دفعہ ملحدین کا ایک گروہ پیش کیا گیا جو بغرضِ قتل گرفتار کر کے لایا گیا تھا۔ حضرت امامؒ نے ان سے سوال کیا اگر کوئی شخص تمہارے سامنے یہ بیان کرے کہ میں نے ایک ایسی کشتی دیکھی جو بغیر ملاح کے دریا کے ایک کنارے کا سامان دوسرے کنارے پر پہنچا رہی ہے تو تم اس شخص کے متعلق کیا رائے قائم کرو گے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہم میں سے کوئی بھی اس بات کو باور کرنے کے لیے تیار نہیں ہوگا اور ہم اسے بالکل خلافِ عقل تصور کریں گے۔ امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا تو پھر تمہاری عقلوں کو کیا ہو گیا ہے کہ تم ایک خود بخود چلنے والی کشتی کا تو تصوّر تک نہیں کر سکتے اور اس اِتنے بڑے کارخانۂ عالم کے متعلق تمہارا خیال یہ ہے کہ یہ بغیر کسی خالق کے آپ سے آپ سرگرم کار ہے۔ ملحدین کے سامنے جب یہ لازوال دلیل آئی تو وہ سب کے سب الحاد سے تائب ہو گئے اور حضرت امامؒ کے دستِ حق پرست

پر مشرف باسلام ہوئے۔

آج کے اس دورِ الحاد پرور میں انسانوں نے فضاؤں میں تیرنا تو سیکھ لیا ہے مگر یہ انسانیت کی کتنی بد قسمتی ہے کہ بعض بے حد سادہ اور پیش پا افتادہ حقیقتیں ہماری نظروں سے اوجھل ہوگئی ہیں۔ شاید ہی کوئی شخص کسی گھر کا گھر والے کے بغیر، کسی باغ کا مالی کے بغیر اور کسی گھڑی کا گھڑی ساز کے بغیر تصور کر سکتا ہو۔ ہم سب مانتے ہیں کہ کوئی صنعت صانع کے بغیر قائم نہیں ہو سکتی مگر بڑے بڑے فضلائے عصر اس دنیائے رنگ و بو کے خود کار ہونے پر دلیلیں گھڑتے ہیں اور ان کے دامن علم و فضل پر کوئی داغ نمایاں نہیں ہونے پاتا۔

مولانا رومؒ نے اسی دلیل کو بڑی عمدگی سے پیش فرمایا ہے کہتے ہیں۔

تن بجاں جنبد نمی بینی تو جاں　　　لیک از جنبیدنِ تن جاں بداں

جسم کا یہ چھوٹا سا کارخانہ روح کے بل پر کام کر رہا ہے مگر روح نظر نہیں آتی ہم اسے جسم کی حرکت اور زندگی سے شناخت کرتے اور اسی چیز کو روح کے وجود کی دلیل ٹھہراتے ہیں۔

پس یقیں در عقلِ ہر دانندہ است　　　ایں کہ با جنبیدہ، جنبائندہ است

اسی طرح ہر دانش مند اسے ایک ثابت شدہ حقیقت سمجھتا ہے کہ جو چیز حرکت کر رہی ہے ضرور کوئی نہ کوئی طاقت اس کے پس پردہ کار فرما ہے۔

روح ہمیں نظر نہیں آتی مگر ہم اسے جسمانی زندگی کے مظاہر سے شناخت کر لیتے ہیں، عقل کا کوئی ٹھوس وجود نہیں ہے مگر ہم بعض علامات سے عقل اور بے عقلی کو مشخص کرتے ہیں۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ اسی طرح خدا بھی نظر نہیں آتا۔ اور ہم اسے اپنی مادی آنکھوں سے دیکھنے کے متحمل نہیں ہیں مگر کائنات کے یہ گوناگوں مظاہر پکار پکار کر اس کے جلال و جبروت اور اس کی ہیبت و قدرت کی شہادت دے رہے ہیں اور یہی اس کی ہستی کی بیّن اور روشن دلیل ہے۔

فصل ۵

خدائے واحد کی صفات

آپ ایک ٹائم پیس کو اٹھا کر دیکھیں اس میں چھوٹے بڑے متعدد کل پرزے ایک دوسرے کے ساتھ پیوست ہو کر کام کرتے ہیں۔ آپ کا دماغ اس نازک مشینری کو دیکھ کر دنگ رہ جائے گا اور سب سے پہلا تاثر آپ یہ قبول کریں گے کہ اس ٹائم پیس کو جس شخص نے بنایا ہے وہ بڑا ہی کاریگر اور اپنے فن میں بڑا ہی ماہر ہے آپ ایک لحظہ کے لیے بھی یہ نہیں سوچیں گے کہ اس کا بنانے والا کوئی بے شعور اور بے حس کاریگر ہو سکتا ہے۔ اس مثال کو سامنے رکھ کر آپ اپنے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات پر نگاہ ڈالیے نیرنگئ قدرت کا نظارہ کیجیے اور پھر تھوڑی دیر کے لیے سوچ کر بتائیے آپ کا دل کیا گواہی دیتا ہے۔ کیا یہ کہ اس دنیا کو معرض وجود میں لانے والی ہستی خاکم بدہن کوئی اندھی بہری اور گونگی ہستی ہے یا وہ کمال اور جمال کی جملہ صفات سے آراستہ ہے؟ ہر سوجھ بوجھ رکھنے والا آدمی اس بات سے اتفاق کرے گا کہ اس کائنات کا خالق تمام تر صفت اور تمام تر خوبی ہے۔

حضرت امام مالکؒ نے خدا کے وجود اور اس کی صفات پر گفتگو کرتے ہوئے ایک خوب بات فرمائی انھوں نے فرمایا کہ ابتدائے آفرینش سے اب تک جتنے انسان پیدا ہوئے ہیں

ان کی تعداد شمار سے باہر ہے لیکن یہ عجیب ماجرا ہے کہ ہر انسان کا چہرہ دوسرے انسان سے کسی نہ کسی حیثیت میں مختلف ہے ــــ انسانی چہرہ جس میں لب و رخسار اور چشم و دندان نظر آتے ہیں ایک چھوٹی سی چیز ہے لیکن خالقِ کائنات ہر چہرہ کے اندر کوئی نہ کوئی ایسی امتیازی شان پیدا کر دیتے ہیں کہ وہ دوسرے انسان سے بآسانی ممیز ہو سکتا ہے۔ جس خالق کی قدرت اور طاقت اور حُسنِ تخلیق کا یہ عالم ہو عقلِ انسانی اس کی بے حد و بے حساب صفتوں کا کیا اندازہ لگا سکتی ہے تا آنکہ وہ خود ہی ان کو بیان نہ فرمائے۔

بعض مذاہب اور فلسفے جس خالق کو مانتے ہیں ان کے نزدیک نظامِ عالم سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے اس نے سب کچھ یا تو اپنے چند مقرب بندوں کو سونپ رکھا ہے یا چند دیوتا مقرر کر دیے ہیں جو دنیا کے مختلف شعبوں کی نگرانی کر رہے ہیں لیکن آدمی کچھ بھی غور کرے تو ایک ذرّہ سے لے کر خورشیدِ درخشاں تک اسی ایک کی یکتائی نظر آتی ہے۔

"لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں"

یہ سارا کارخانہ براہِ راست اس ایک خدا کی مرضی اور مشیت کے تحت چل رہا ہے ورنہ عناصر کا یہ حیرت انگیز توافق، باہم گر ایک دوسرے سے تعاون، سورج کے طلوع و غروب کا نظام، گردشِ لیل و نہار، باد و باراں کے کرشمے اور برق و خرمن کی آویزش کے مظاہرے، ایک لمحہ کے لیے بھی قلبِ انسانی کو حیرت و مسرت کے ملے جلے جذبات سے معمور نہ کرتے۔

ہم خدا کو نہیں دیکھ سکتے لیکن اس کی رحمت اور ربوبیت کا ہر آن مشاہدہ کر سکتے ہیں اس کی بے پناہ طاقتوں کی جھلکیاں دیکھ سکتے ہیں۔ اس کے جلوہ ہائے حکمت و قدرت سے ہر گھڑی ہماری آنکھیں خیرہ ہوتی ہیں ــــ پس دانش مندی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم مجرد ایک طاقت کی پرستش نہ کریں بلکہ خالق کی ان ساری صفتوں پر ایمان لائیں جو قرآن میں بیان ہوئی ہیں اور جو شب و روز نوعِ انسانی پر پرتو فگن ہیں۔ اسی طرح ہم اس سے اپنا صحیح تعلق استوار کر سکتے ہیں اور اسی سے ہمارے دل میں اس کی محبت اور اس کا خوف پیدا ہو سکتا ہے۔

فصل ۶

اللہ پر ایمان کا پہلا تقاضا

توحید کے معاملے میں اسلام انسانوں کو صرف یہیں لاکر نہیں چھوڑ دیتا کہ وہ عقلی طور پر خدا کے وجود پر مطمئن ہو جائیں اور شک وشبہ کا کوئی کانٹا ان کے دل ودماغ میں کھٹک پیدا نہ کرے بلکہ وہ ایک قدم اور آگے بڑھ کر یہ مطالبہ پیش کرتا ہے کہ جب تم دنیا کی اس سب سے بڑی سچائی پر ایمان لے آئے تو اب تمھارا فرض یہ ہے کہ اپنی زندگی کے کسی لمحہ میں بھی اس حقیقتِ عظمٰی کو اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دو۔ تم جہاں ہو جس حال میں ہو یہ عقیدہ تمھارے ذہن میں تازہ رہنا چاہیے کہ تم ایک آقا کے بندے اور ایک مالک کے غلام ہو۔ اور اس کی اطاعت اور وفاداری کا عہد کر چکے ہو۔ توحید پر ایمان لانے والے افراد کی مثال ایک پیاسے کی ہونی چاہیے کہ وہ جس کام میں بھی مشغول ہو پانی کا تصوّر اس کے ذہن سے اوجھل نہیں ہونے پاتا۔ اسی طرح ایک موحّد بھی بظاہر ایک دکان پر بیٹھ کر گاہکوں کو سودا دے رہا ہوتا ہے اور کسی دفتر میں ملازمت کے فرائض کی انجام دہی میں مصروف ہوتا ہے لیکن اس وقت بھی درحقیقت اس کے رگ وریشہ

میں خدا کا تصور اور اسی کا ذکر جاری و ساری ہوتا ہے وہ دنیا کے دھندوں میں الجھ کر بھی اپنے آقا و مولا کی اطاعت سے غافل نہیں ہوتا یہی وہ کیفیت ہے جسے

"دل بہ یار و دست بکار"

سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہی وہ مقامِ عبدیت ہے جو صوفیاء کے نزدیک "خلوت در انجمن" کے عنوان سے مطلوب اور محبوب ہے۔ قرآنِ حکیم نے بھی کہا۔

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ

"وہ لوگ کہ جنھیں خرید و فروخت اور سوداگری خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتی دراصل وہی لوگ ہیں جو ایمان باللہ کی باریکیوں اور نزاکتوں سے صحیح معنی میں رمز آشنا ہیں"۔

ہمہ وقت عقیدۂ توحید کو تازہ رکھنے کی ضرورت اور اہمیت بلکہ فرضیت احادیثِ نبوی سے ثابت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "افضل الذکر لا الٰہ الا اللہ" قولی ذکر تو یہ ہے کہ ہم زبان سے بار بار خدا کی حمد و تسبیح کریں۔ اٹھتے بیٹھتے وہ کلمات دہرائیں جو حضورؐ نے تلقین فرمائے ہیں اور عملی ذکر یہ ہے کہ ہم چوبیس گھنٹوں میں ہر لمحہ اپنی عادات و اطوار مشاغل و معاملات، پسند اور ناپسند اور جملہ اقوال و افعال میں خدا کی بندگی اور غلامی کو پیشِ نظر رکھیں اور اپنی سیرت و کردار کے جملہ پہلوؤں کو ذکر کے نور سے منور کر دیں۔ اپنے بال بچوں میں دکان پر اور درس گاہ میں اور حکومت کی کرسی پر ہر جگہ ہم اپنے عمل سے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کی حقیقت کو تازہ کرتے رہیں۔ حتیٰ کہ یہ عقیدہ ہمارا جزوِ عمل بن جائے کہ

ہر وہ لمحہ ہے مرا، کفر میں شامل اے دوست
دل تری یاد سے جس میں ہوا غافل اے دوست

فصل ۷

خُدا کی محبّت

دوسرے عقائد و تصوّرات کے معاملے میں صرف دماغی طور پر مطمئن ہو جانا کافی سمجھا جاتا ہے۔ کوئی شخص عقلی طور پر کمیونزم یا سوشلزم کا قائل ہو جائے تو یہی چیز اسے کمیونسٹ یا سوشلسٹ بنانے کے لیے کافی ہے لیکن اسلام نے عقیدۂ توحید کے جو لوازمات ہمارے سامنے پیش کیے ہیں ان کی رو سے دماغ ہی کو نہیں دل کو بھی اور اعضاء و جوارح ہی کو نہیں روح کو بھی اس سرور و کیفِ سرمدی سے سرشار بنانا ضروری ہے۔ جب تک توحید کا اعتقاد ایک مسلم کے دل میں جذبہ کی شکل اختیار نہ کرلے اس کا ایمان مکمل نہیں ہوتا۔ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ ابن مسعود کا یہ قول "الیقین الایمان کُلہ" یقین ہی ایمان کی روح ہے۔" دراصل اسی کیفیت کا ترجمان ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ ہم اپنے ایمان کی تعمیر دلائل سے زیادہ یقین کی بنیاد پر کریں۔ جب ہمیں توحید پر یقین حاصل ہو جائے گا تو اس کے لیے دلائل آپ سے آپ ہمارے سامنے آتے جائیں گے۔ شیخ عبدالوہاب شعرانی نے صحیح فرمایا کہ دلیل و برہان کی بنیاد پر حاصل ہونے والا ایمان قابلِ اعتماد نہیں ہوتا کیونکہ وہ دلیل کے ساتھ گھومتا رہتا ہے۔ دلائل پرست کا ایمان کبھی خطرات سے بے خطر نہیں ہو سکتا۔ یقین کی دولت اسی وقت ہاتھ آتی ہے جب آدمی دماغی طور پر ہی نہیں قلبی طور پر بھی عقیدۂ توحید

کی تصدیق کرے اور خدا کو ماننے ہی نہیں بلکہ اس سے دنیا کی تمام چیزوں سے بڑھ کر محبت کرے، قرآن میں ایمان والوں کی جو صفتیں بیان ہوئی ہیں ان میں سے ایک صفت یہ بھی ہے کہ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ۔ وہ خدا سے سب سے بڑھ کر محبت کرنے والے ہوتے ہیں۔

بعض لوگوں کے نزدیک محبت شاید یہ ہے کہ انسان ترکِ دنیا کر کے کسی گوشہ میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنا شروع کردے اور بیوی بچوں کو کس مپرسی کی حالت میں چھوڑ چھاڑ کر فرار کی راہ اختیار کرے۔ یہ محبت نہیں بلکہ احکامِ خداوندی سے انحراف ہے اور جو شخص اس کا مرتکب ہوتا ہے وہ یقیناً خدا کے نزدیک سزا کا مستوجب ہے۔ اسلام یہ نہیں چاہتا کہ ہمارے دل میں بیوی بچوں کی محبت سرے سے موجود ہی نہ ہو یا ہم کاروبارِ دنیا میں مشغول ہی نہ ہوں۔ امام ابنِ تیمیہؒ نے خوب فرمایا کہ انبیاء تبدیلِ فطرت کے لیے نہیں بلکہ تکمیلِ فطرت کے لیے تشریف لائے ہیں۔ اگر محبتِ الٰہی کا مروجہ مفہوم صحیح قرار دیا جائے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ آدمی کو اپنی فطرت کے خلاف اعلانِ جنگ کرنے کے لیے ابھارا جائے۔ پس حقیقت میں محبت اس کو نہیں کہتے۔ محبت یہ ہے کہ ہم دنیا میں رہیں۔ بیوی بچوں کے حقوق ادا کریں، تمام فطری علائق سے متعلق رہیں مگر جب خدا کی محبت اور ان چیزوں کے درمیان کسی ایک کو ترجیح دینے کا سوال پیدا ہو تو ہم دنیا کے سارے تعلقات اور ساری رشتہ داریوں اور دوستیوں کو خدا کے رستے میں قربان کر دیں۔ زندگی جیسی محبوب متاع سے اگر اس کے نام پر ہاتھ اٹھانا پڑ جائیں تو ہمیں اس میں بھی تامل نہ ہو اور خدا کی راہ میں جان دے دینے کے بعد بھی ہمارے احساسات کا عالم یہ ہو کہ

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

فصل ۸

خُدا کی محبّت کا صحیح تصوّر

حضور سرورِ کائناتؐ اور آپ کے صحابہ سے بڑھ کر کس کو خدا سے محبت ہو گی لیکن وہ تجارت بھی کرتے تھے بیوی بچے بھی رکھتے تھے۔ دنیا کی جائز لذتوں اور راحتوں سے متمتع بھی ہوتے تھے اور اس کے باوجود انھیں خدا کی محبت کا وہ بلند مقام حاصل تھا جس پر آسمان کے فرشتے بھی رشک کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ خدا کی محبت دوسری تمام محبتوں کی نقیض نہیں ہے اس کا تقاضا فقط یہ ہے کہ دوسرے تمام تعلقات اس کے تحت ہوں۔ وہ جس تعلق کو جوڑنے کا حکم دے اسے جوڑا جائے اور جس تعلق کو توڑنا چاہے اسے توڑ دیا جائے۔ ایک آدمی اس طرح جب خدا کے اذن اور فرمان کے تحت بیوی بچوں سے محبت کرتا ہے۔ کوئی دکان کھولتا ہے یا کھیتی باڑی کرتا ہے تو اس کے یہ سب کے سب کام خدا کے نزدیک پسندیدہ ہوتے ہیں اور ان میں ایک ایک صَرف شدہ لمحہ حاصلِ محبت قرار پاتا ہے۔

بیٹے سے محبت کرنا اسی نے سکھایا ہے۔ اس کے لیے جو حد اس نے مقرر کردی ہے اگر آپ اس کی پابندی کریں تو مستحقِ اجر ٹھہریں گے۔ بس اس کا مطالبہ اتنا ہے کہ بیٹے کی یہ محبت خدا کے رستے میں حائل نہیں ہونی چاہیے بلکہ وہ حکم دے تو اپنے ہاتھ سے بیٹے کی گردن پر چھری چلانے کے لیے بھی تیار ہو جانا چاہیے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ ہمارے سامنے ہے۔ بڑھاپے میں انھیں اسمٰعیل جیسا فرزند عطا ہوا۔ خلیل اللہ کو اس مایۂ ناز فرزند سے جو محبت ہو سکتی ہے، اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن جب بارگاہِ الٰہی سے اشارہ کیا گیا تو حضرت ابراہیمؑ نے خود اپنے ہاتھوں بیٹے کی گردن پر چھری چلادی۔

حضرتِ صدیقِ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق تاریخِ اسلام کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک دفعہ ان کے صاحبزادے نے ان سے عرض کی ابا جان! حالتِ کفر میں ایک دفعہ میں کفّار کی طرف سے لڑ رہا تھا کہ اثنائے جنگ میں آپ میرے سامنے آگئے میں چاہتا تو آسانی سے آپ پر ہاتھ اٹھا سکتا تھا لیکن باپ کی حیثیت سے آپ کا مقام نظر میں پھر گیا اور میں اپنے ارادہ سے باز آگیا۔

حضرتِ صدیقِ اکبرؓ فرمانے لگے۔ بیٹا! تم نے تو مجھے باپ سمجھ کر چھوڑ دیا لیکن میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر تم میرے سامنے آجاتے تو میں تلوار سے تمھاری گردن اڑا دیتا۔

یہی وہ مقام ہے جس پر فائز ہونے کے بعد ایک بندۂ موحّد خود خدا کا محبوب بن جاتا ہے اور حدیثِ نبوی کے مطابق اللہ تعالیٰ اس کی آنکھ، اس کی زبان، اس کے ہاتھ اور اس کے پاؤں بن جاتا ہے۔ وہ وہی کچھ دیکھتا، بولتا اور کرتا ہے جو خدا کی رضامندی اور پسند کے عین مطابق ہو۔

فصل ۹

توحید پر استقامت

عقیدۂ توحید کے سلسلے میں ایک اور لازمی شرط استقامت کی ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ آدمی اس رستے میں آنے والی تمام تکلیفوں اور مصیبتوں پر ثابت قدمی دکھائے اور حالات کی سنگینی اور نزاکت کے باوجود اس کے اطمینان اور یقین میں کمی واقع نہ ہو۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ شاید توحید کا اقرار کر لینا ایک آسان کام ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ وہ منزل ہے جس پر پہنچنے کے لیے۔

"شرطِ اول قدم این است کہ مجنوں باشی"

آپ غور کریں گے تو معلوم ہو گا کہ کلمۂ توحید کے دو اجزا ہیں۔ سب سے پہلا جز نفی کا ہے یعنی کوئی خدا نہیں اور دوسرا اثبات کا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ۔

"سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے"

جب آدمی پورے شعور کے ساتھ ماسوا اللہ کی خدائی کا انکار کرتا ہے تو اس کے ارد گرد اَنَا وَلَا غَیْرِی کا ڈنکا بجانے والے تمام جھوٹے خدا بپھر جاتے ہیں۔ اور وہ

اسے ہر ممکن طریقے سے جادۂ راستی سے ہٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ برادری الگ طیش میں آجاتی ہے۔ جب اس کے غلط رسم و رواج پر ضرب پڑتی ہے۔ چوہدری الگ درپئے آزار ہو جاتے ہیں۔ جب ان کے حلقۂ اطاعت سے نکلنے کی کوشش کی جاتی ہے استحصالی نظام ایسے باغی کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا اور اس اعلان کے بعد سب سے بڑھ کر خود انسان کا اپنا نفسِ سرکش ایمان کا ڈاکو بن جاتا ہے اور قدم قدم پر ایک بندۂ مومن کو شکست دینے کی کوشش کرتا ہے۔ غرضیکہ ایک غلط ماحول میں توحید پر ایمان لانے والا شخص اپنے آپ کو انسانوں کے بجائے جنگل کے درندوں میں گھرا ہوا محسوس کرتا ہے اور اس کی ساری زندگی ایک مستقل امتحان اور آزمائش میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

توحید کے رستے میں یہ سارے مرحلے "نفی" کے جزو کا لازمی نتیجہ ہیں۔ آپ ان سے گزر کر ہی اثبات تک پہنچ سکتے ہیں۔ شرک سے پوری طرح پاک و صاف ہونے کے بعد ہی توحیدِ کامل کی منزل آئے گی اور شرک سے بچنے کے لیے ان آزمائشوں اور امتحانوں کا سامنا کیے بغیر چارہ نہیں۔ اقبال مرحوم نے ٹھیک کہا تھا۔

چو مے گویم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را

خود آنحضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید کے ساتھ ساتھ استقامت کا ذکر کیا ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو عمرۃؓ سفیان بن عبداللہ سے روایت ہے۔

قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قُلْ	میں نے عرض کیا یا رسول اللہ مجھ کو
لِیْ فِی الْاِسْلَامِ قَوْلًا لَا	اسلام کے بارے میں ایسی بات بتلا
اَسْئَلُ عَنْہُ اَحَدًا بَعْدَکَ	دیجیے کہ میں پھر کسی سے نہ پوچھوں۔ آپ
قَالَ قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ	نے فرمایا اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ

ثُمَّ اسْتَقِمْ۔ (یعنی اللہ پر ایمان لایا) کہو اور اس کے بعد ثابت قدم رہو۔

(مسلم)

قرآن مجید میں اسی بات کو یوں فرمایا گیا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْہِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ۚ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ الْجَنَّۃِ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا جَزَآءًۢ بِمَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ۔	انھوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے۔ پھر ثابت قدم رہے تو نہ ان کو خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ وہی لوگ جنت والے ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، یہ اس کا بدلہ ہے جو وہ کرتے تھے۔

(احقاف۔ع ۳)

گویا:۔

این شربتِ عاشقی ست خسرو ——— بے خونِ جگر چشید نتواں

فصل ۱۰

توحید کی نشر و اشاعت

توحید کے تقاضے یہیں آکر ختم نہیں ہوجاتے کہ ایک آدمی خود اپنی ذات کی حد تک ان پر عمل پیرا ہوجائے اور یہ سمجھے کہ بس میرے خدا کو یہی کچھ مطلوب تھا، اور مجھ پر جو فرائض عائد ہوتے تھے وہ ادا ہوگئے جو شخص یہ سمجھتا ہے وہ ابھی توحید کی منزلِ حقیقی سے کوسوں دور ہے۔ اسلام صرف اسی بات پر مطمئن نہیں ہوجاتا وہ اور آگے بڑھتا ہے اور یہ مطالبہ کرتا ہے کہ جب تم خود ایمان لاچکے تو اب تمہارا فرض یہ ہے کہ دوسروں کو بھی اس سرچشمۂ فیض سے سیراب ہونے کی تلقین کرو۔

لوگوں کو خالقِ کائنات کی بندگی پر ابھارو اور جب تک دنیا میں کفر و شرک کے پرچم سرنگوں نہ ہوجائیں تم توحید کی دعوت دینے سے باز نہ آؤ۔ قرآنِ حکیم نے امتِ مسلمہ کا مقصدِ وجود بتاتے ہوئے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا — اور اسی طرح کیا ہم نے تم کو امت معتدل

لِتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا۔

تاکہ ہو تم گواہ لوگوں پر، اور رسول تم پر گواہ ہو۔

آنحضور نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت ختم کردی گئی۔ اب دنیا کو توحید کی طرف بلانے کا کام آپ کی امت کے سپرد کیا گیا ہے۔ اور امتِ مسلمہ بحیثیتِ مجموعی اور اس کا ایک ایک فرد اپنی انفرادی حیثیت میں اس فریضہ کی ادائیگی کا ذمہ دار ہے۔ علامہ اقبال مرحوم نے رموزِ بے خودی میں مسلمانوں کو ان کا یہی منصب یاد دلانے کی کوشش کی ہے۔

می ندانی آیۂ اُمّ الکتاب ... اُمّتِ عادل ترا آمد خطاب

آب و تابِ چہرۂ ایامِ تو ... در جہاں شاہد علی الاقوام تو

(کیا تو قرآنِ حکیم کی اس آیت سے واقف نہیں جس میں تجھے امتِ عادل کا خطاب دیا گیا ہے۔ تُو ہی تو چہرۂ ایام کی آب و تاب ہے اور تجھے ہی تو دنیا کی تمام قوموں پر حق کا گواہ بنا کر بھیجا گیا ہے)

اور یہ کہ:۔

زانکہ در تکبیر رازِ بودِ تست ... حفظ و نشرِ لا الٰہ مقصودِ تست

تا نہ خیزد بانگِ حق از عالمے ... گر مسلمانی نیا سائی دمے

(تکبیر ہی میں تیری ہستی کا راز پنہاں ہے۔ عقیدہ لا الٰہ الا اللہ کی حفاظت و اشاعت تیرا مقصود ہے۔ اگر تُو مسلمان ہے تو جب تک سارے جہان سے حق کا کلمہ بلند نہ ہو جائے تجھے دم نہیں لینا چاہیے)

مسلمانوں کا یہ وہ فریضۂ حیات ہے جو کسی حال میں بھی ساقط نہیں ہوتا۔ حالات سازگار ہوں یا نہ ہوں۔ ذرائع و وسائل حاصل ہوں یا ان کا فقدان ہو ہر حال میں توحید کی تبلیغ ضروری ہے۔

آج جب کہ دنیا نے پھر سے بے شمار بت گھڑ لیے ہیں۔ کہیں سرمایہ و دولت کی پرستش ہو رہی ہے، کہیں قبیلہ و خاندان اور رنگ و نسل کی اور کہیں وطن کی خاک کو دیوتا بنا کر پوجا جا رہا ہے۔ ضرورت ہے کہ مسلمان اپنا مقام پہچانیں اور دنیا کے سومنات میں پھر سے توحید کی اذان پکارنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ بقول اقبالؒ

فکرِ انساں بُت پرستے بُت گرے ہر زماں در جستجوئے پیکرے
باز طرحِ آذری انداخت است تازہ تر پروردگارے ساخت است
اے کہ خوردستی ز مینائے خلیلؑ گرمیٔ خونت ز صہبائے خلیلؑ
بر سرِ ایں باطلِ حق پیرہن تیغِ "لا موجود الا ھُو" بزن
جلوہ در تاریکیٔ ایام کن آنچہ بر تو کامل آمد عام کن

(انسانی فکر و ذہن بُت پرست بھی ہے اور بُت گر بھی۔ اسے ہر زمانے میں ایک پیکرِ محسوس کی جستجو رہتی ہے۔ اس نے آج بُت پرستی کے لیے نئے نئے پروردگار بنائے ہیں۔ اے کہ تو نے مینائے خلیل سے جام نوش کیے ہیں اور اسی ابراہیمی مئے توحید سے تیرے خون میں گرمی پائی جاتی ہے، حق کے لبادوں میں چھپے ہوئے اس باطل پر "لا موجود الا ھُو" کی شمشیر سے حملہ آور ہو۔ ظلمتِ روزگار میں نور پاشیاں کر اور جو دین تجھ پر کامل ہو چکا ہے اسے عام کرنے کی فکر کر۔

فصل ۱۱

انسانی زندگی پر توحید کے اثرات

فقر و احتیاج انسان کی سرشت میں داخل ہے وہ ہزار ترقی کر جائے لیکن کسی کے آگے جھکنے اور کسی نہ کسی کو معبود بنانے سے باز نہیں آ سکتا۔ وہ آگ کو دیکھتا ہے کہ اس سے کتنی ہی انسانی ضروریات وابستہ ہیں تو اسے ہی پوجنا شروع کر دیتا ہے۔ سورج اور چاند اسے دنیا کے لیے فیض رساں نظر آتے ہیں تو ان کے آگے گر پڑتا ہے۔ گنگا اور جمنا کے ذریعے فصلوں کو لہلہاتے اور انسانوں کو اپنی پیاس بجھاتے دیکھتا ہے تو انھیں ہی اپنا حاجت روا اور مشکل کشا مان لیتا ہے اور کبھی کبھی اس مقام سے بھی گر کر اپنے جیسے انسانوں کے حضور ماتھا ٹیکتا ہے بلکہ اپنے ہاتھوں مٹی کے مجسّے تراشتا اور ان کے آگے ڈنڈوت بجا لاتا ہے۔ آج دنیا نے بہت کچھ ترقی کر لی ہے لیکن اس کے باوجود آدمیت فقر اور احتیاج سے اپنے آپ کو نہیں چھڑا سکی۔ آج بھی آپ غور سے دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اسلوب اور انداز تو ضرور بدل گیا ہے۔ لیکن پرستش، اور انسان کے

احساسِ عبدیت میں کوئی فرق واقع نہیں ہُوا۔ لوگ آج بھی ہیرو ورشپ میں مبتلا ہیں، دولت اور سرمایہ کو عمل سے اپنا معبود بنائے ہوئے ہیں۔ کہیں دھرتی ماتا کی پوجا ہو رہی ہے اور کہیں سائنس کو جگہ دے دی گئی ہے۔

انسانی فقر و احتیاج کو ان غلط راستوں سے پورا کرنے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے، کہ آدمی بے شمار چوکھٹوں پر جبہ سائی کرنے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے اور خواہشاتِ نفس اور معاشرے کی تمام غلط طاقتیں اس کی خدا بن جاتی ہیں اور اس طرح ایک انسان سینکڑوں مصنوعی خداؤں میں گھِر کر رہ جاتا ہے، عقیدۂ توحید کا سب سے پہلا اثر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انسان ان بے شمار بناوٹی آقاؤں کی غلامی سے نکل کر صرف ایک آقا اور مالک کا بندہ بن جاتا ہے۔

یہ ایک سجدہ جسے تُو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

جب ایک بندۂ موحد اس حقیقت پر ایمان لے آتا ہے کہ خدا کے سوا کوئی نافع و ضار نہیں کوئی نفع و نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ سُود و زیاں سب اسی کے اختیار میں ہے تو وہ کسی سے خوف نہیں کھاتا اور سخت مشکل سے مشکل حالات میں بھی اس کے حوصلے پست نہیں ہوتے۔ فرعون و نمرود ہوں یا قارون و ہامان وہ کسی کے سامنے اپنا سر جھکانے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ اس کے پیشِ نظر خدا کا یہ فرمان ہوتا ہے کہ "فَلَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُونِ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ" اگر تم مومن ہو تو ان سے خوف نہ کرو مجھ سے خوف کرو۔ وہ دنیا کے سب سے بڑے موحد کے اس ارشاد کو اپنے لیے مشعلِ راہ بناتا ہے کہ۔

"وَلَوِ اجْتَمَعُوا الْعِبَادُ أَنْ	اگر سب بندے مل کر کوشش کریں کہ تجھے
يَّنْفَعُوْكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَقْضِهِ	اس چیز سے نفع پہنچائیں جو اللہ نے تیرے
اللّٰهُ لَكَ لَمْ يَقْدِرُوْا	لیے مقدر نہیں کی تو وہ ایسا کرنے کی قدرت

عَلَيْهِ وَلَوْ جَهَدَ مَا الْعِبَادُ أَنْ يَّضُرُّوْكَ بِشَيْءٍ لَّمْ يَقْضِهِ اللّٰهُ عَلَيْكَ لَمْ يَقْدِرُوْا۔"

نہیں پائیں گے اور اگر سب بندے مل کر تجھے کسی چیز سے ضرر پہنچانے کی کوشش کریں جو اللہ نے تیرے لیے مقدر نہیں کی تو وہ اس پر قدرت نہ پائیں گے (حدیثِ نبوی۔ روایت از حضرت عبداللہ بن عباسؓ)

خدا پر ایمان لانے کے بعد جب انسان کے دل سے ماسوا اللہ کا ڈر اور خوف نکل جاتا ہے تو وہ قیصر و کسریٰ کے دربار میں قالینوں کو نیزے سے چھیدتا ہوا جاتا ہے اور بغیر کسی جھجک کے بادشاہ کے ساتھ تخت پر جا بیٹھتا ہے۔ دشمن سوتے میں اس کی تلوار پر قبضہ کر لیتا ہے اور اسے جگا کر شمشیر بدست سوال کرتا ہے۔ "بتاؤ! اب تمھیں کون بچا سکتا ہے" اور وہ اطمینان سے جواب دیتا ہے "اللہ" اور دشمن کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ جاتی ہے وہ بڑے بڑے جبّاروں کو برسرِ مجلس ان کی غلط کاریوں پر ٹوک دیتا ہے اور ان کے جاہ و جلال اور خزانے اور لشکر سے مرعوب نہیں ہوتا۔ اس کی زندگی میں یہ حیرت انگیز انقلاب اس لیے رُونما ہوتا ہے کہ وہ خدا کے سوا کسی کا خوف نہیں کھاتا اور دنیا والوں سے ڈرنا اس کے نزدیک حرام ہوتا ہے۔

موحّد کہ در پائے ریزی زرش وگر آرہ می نہی بر سرش

امید و ہراسش نہ باشد ز کس ہمیں است بنیادِ توحید و بس

(موحّد وہ ہے کہ خواہ تو اس کے قدموں میں زر و مال کے انبار لگا دے یا اس کے سر پر آرہ رکھ دے اسے نہ کسی شخص سے کوئی امید ہوتی ہے نہ ہراس، اور دیکھا جائے تو توحید کی بنیاد ہی یہی چیز ہے)

جب مشکلات اس پر یورش کرتی ہیں اور وہ گھبرا کر دنیاوی سہاروں پر تکیہ کرنے کا خیال دل میں لاتا ہے انسانوں اور اپنے جیسے انسانوں کی پناہ ڈھونڈنے پر اپنے آپ کو

مجبور پاتا ہے تو دفعتہً اپنے رب کا یہ فرمان اس کے سامنے آجاتا ہے۔" اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ " کیا میں اپنے بندے کے لیے کافی نہیں ہوں۔ تو اس کے ڈگمگاتے ہوئے قدم جم جاتے ہیں اور اس کی روح ایک ان جانے سرور سے جھوم اٹھتی ہے۔

وہ غریب اور مفلس ہوتا ہے۔ فاقے کرتا اور پیٹ پر پتھر باندھتا ہے۔ دنیا کی لذتیں اور راحتیں اسے نصیب نہیں ہوتیں۔ لیکن خدا کے رازق ہونے کا تصور اس کی غیرت کو اس حد تک جلا بخش دیتا ہے کہ اس کے نزدیک کسی کے آگے دستِ سوال دراز کرنا عقیدۂ توحید کے منافی ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر اس کے ہاتھ سے کوڑا بھی گر جائے تو وہ خود اُتر کر اسے اٹھا لیتا ہے۔ لیکن کسی سے کوڑا اٹھانے کی درخواست نہیں کرتا۔

حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلایا اور مجھ سے یہ شرط کی کہ دیکھنا کسی سے کچھ سوال نہ کرنا۔ میں نے عرض کیا قبول ہے۔ آپ نے فرمایا۔ اگر تمھارے ہاتھ سے کوڑا گر جائے تو اپنا کوڑا بھی نہ مانگنا، یہاں تک کہ اُترنا اور اس کو خود اٹھا لینا۔"

اسے دنیا میں جاہ و منزلت حاصل ہوتی ہے۔ دنیا بھر کے ذرائع و وسائل اسے مہیا ہوتے ہیں تمام کائنات اس کی چاکر اور غلام ہوتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کے دل میں تکبر کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ وہ لوگوں میں مال تقسیم کرتا ہے لیکن ساتھ ہی بتاتا جاتا ہے کہ یہ مال میرا نہیں خدا کا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو مال تقسیم کرتے تو ساتھ یہ بھی فرماتے "اِنَّمَا اَنَا قَاسِمٌ وَاللّٰهُ يُعْطِيْ" دیکھو میں تو صرف ایک تقسیم کرنے والے کی حیثیت رکھتا ہوں۔ دراصل دینے والا تو اللہ تعالیٰ ہی ہے۔"

عقیدۂ توحید کو زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنا لینے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان طاقت اور مقام و مرتبہ کے نشہ میں سرمست نہیں ہونے پاتا۔ بڑے بڑے بادشاہ اس کا نام سن کر کانپ کانپ جاتے ہیں، اسے فتوحات پر فتوحات حاصل ہو رہی ہوتی ہیں لیکن وہ ان کامیابیوں

کو خلقِ خدا پر رعب گانٹھنے کا ذریعہ نہیں بناتا اور بھرے مجمع میں یہ اعلان کرتا ہے کہ۔

"لوگو! اگرچہ آج میں تمہارا خلیفہ ہوں لیکن مجھے خوب یاد ہے کہ میں کل تک بکریاں چرایا کرتا تھا۔"

غربت اور تنگدستی میں بھی اس کا دل سکون اور اطمینان سے معمور ہوتا ہے وہ معاشی بدحالی اور خستگی کے باعث ناشکرا اور بے صبر نہیں ہونے پاتا۔ وہ ہر حال میں قناعت کرتا اور اپنے آقا اور مالک کا شکر ادا کرتا ہے۔ شکوہ و شکایت کا کوئی لفظ اس کی زبان پر نہیں آتا اور یہ یقین اسے صبر و شکر اور قناعت کی دولت سے مالامال کردیتا ہے کہ رازقِ کائنات نے میرے لیے جو رزق مقدر کیا ہے وہ مجھے مل کر رہے گا اور اگر وہی یہ چاہتا ہے کہ میں افلاس و ناداری میں مبتلا رہوں تو دراصل اسی میں میرے لیے خیر اور برکت پوشیدہ ہے۔ یہ حدیثِ قدسی اس کا جزوِ ایمان ہوتی ہے کہ

حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ "میرے بندوں میں کوئی ایسا بھی ہے کہ تونگری یا غنا کے سوا کوئی چیز اس کو صالح نہیں کرسکتی اگر میں اس کو فقیر کردوں تو یہ فقر اس کو بگاڑ دے اور کوئی ایسا بھی ہے کہ اس کو فقیری و درویشی کے سوا کوئی چیز نیک نہیں بناسکتی اگر میں اس کو غنی کردوں تو غنا اس کے ایمان کو فاسد کردے اور کوئی ایسا بھی ہے کہ اس کو صحت و تندرستی کے سوا کوئی چیز درست نہیں رکھ سکتی اگر میں اس کو بیمار کردوں تو وہ بیماری اس کے ایمان کو بگاڑ دے اور کوئی ایسا بھی ہے کہ بیماری کے سوا کوئی چیز اس کے ایمان کو درست نہیں رکھ سکتی۔ اگر میں اس کو تندرست رکھوں تو یہ تندرستی اس کے ایمان کو فاسد کردے مجھے اپنے بندوں کے احوال سے پوری آگاہی ہے اور میں ان کے مطابق اپنا کام کرتا ہوں" (حدیث الوالی)

وہ سریرآرائے حکومت ہوتا ہے تو خوفِ خدا اس کے اندر ذمہ داری کا وہ احساس

پیدا کردیتا ہے کہ رعایا کے ایک ایک فرد کی ضروریاتِ زندگی اسے اپنے ذمّے نظر آتی ہیں وہ یہاں تک سوچتا ہے کہ.

"اگر دجلہ کے کنارے کوئی کُتا بھی بھوک سے مرگیا تو عمرؓ سے اس کی بھی باز پرس ہوگی۔"

وہ حکومت کے خزانے کو باپ دادا کی جاگیر سمجھنے کی بجائے "مالِ یتیم" قرار دیتا ہے جس کو ہڑپ کرنا اس کے نزدیک پیٹ میں جہنّم کے انگارے بھرنے کے مترادف ہوتا ہے۔ اس سے سرکاری کام کے لیے ضرورت سے قدرے زائد کاغذ بھی طلب کیا جائے تو یہ فرمان جاری کرتا ہے کہ.

"قلم باریک کردو اور گنجا ہوا لکھو اور ایک پرچہ میں بہت سی ضرورتیں لکھ دیا کرو اس لیے کہ مسلمان کو ایسی لمبی چوڑی بات کی ضرورت نہیں جس سے خواہ مخواہ بیت المال پر بار پڑے۔"

(سیرتِ عمر بن عبدالعزیزؒ صہ ۶۴)

وہ سرکاری خزانے سے کوئی بھاری مشاہرہ نہیں لیتا۔ فقط اتنا ہی لیتا ہے جس سے اس کی زندگی بسر ہو سکے اور جب وفات کا وقت آتا ہے تو اپنے وارثوں کو حکم دے جاتا ہے کہ میں نے بیت المال سے اب تک جو کچھ لیا ہے اس کا حساب کر لیا جائے اور کل رقم میری ذاتی ملکیت سے واپس کردی جائے، وہ اپنی بیٹی کو وصیت کرتا ہے

"جب میں وفات پا جاؤں تو مسلمانوں کے برتن، ان کا غلام، ان کی اونٹنی، ان کی چکیاں اور ان کی دو چادریں، جو میں اوڑھنے اور بچھانے کے لیے استعمال کرتا تھا۔ واپس کردی جائیں (حضرت عائشہؓ کے نام حضرتِ ابوبکر صدیقؓ کی وصیت)

فصل ۱۲

ایک
خدا
ایک
انسان
اور
ایک
نظام

دنیا آج رنگ نسل اور وطن کی حد بندیوں کے باعث ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ گئی ہے اور علم کی روشنی کے باوجود گورے اور کالے کے سوال پر یورپ میں فسادات ہو رہے ہیں لیکن عقیدۂ توحید بنی نوعِ انسان کے لیے اجتماعیت کی جو بنیادیں فراہم کرتا ہے ان پر ایک ایسا پاکیزہ اور محبت و اخوّت سے معمور معاشرہ تعمیر ہوتا ہے جس میں اس طرح کے کسی جاہلانہ امتیاز کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اس معاشرہ کی اساس توحید کے سب سے بڑے رمز شناس محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش کردہ اس اصول پر ہوتی ہے کہ

"تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم کی خلقت مٹی سے ہوئی، نہ کسی عرب کو کسی غیر عرب پر فضیلت ہے نہ کسی غیر عرب کو عرب پر سوائے تقویٰ کے۔"

(خطبہ حجۃ الوداع)

اس سنہری اصول پر جو سوسائٹی بنتی ہے اس میں ہر شخص کو زندگی سے استفادہ کرنے

کامساوی حق حاصل ہوتا ہے یہاں کسی ایک خاندان یا گروہ کی اجارہ داری نہیں ہوتی بلکہ ہر وہ شخص جو توحید پر ایمان لاتا ہے اختیار و اقتدار میں برابر کا شریک ہوتا ہے۔ یہاں حکومت شہنشاہیت کے انداز پر نہیں چلتی خلافتِ جمہور کے نظریہ پر چلتی ہے، احبش کے بلالؓ، روم کے صہیبؓ، فارس کے سلمانؓ اور عرب کے فاروقؓ و صدیقؓ اس میں ایک جیسے حقوق رکھتے ہیں۔ جغرافیائی حدود و قیود اور زبان و نسل کے اختلافات اس عالم گیر معاشرہ کی راہ میں حائل نہیں ہوتے۔ یہ اسی کا فیض تھا کہ ہندوستان کے ساحل پر ایک مظلوم عورت کی پکار عرب کے فرمانروا کو بے چین کر دیتی تھی۔ احترامِ آدمیت کا یہی وہ نظام ہے۔ جس کے تحت حاکم و محکوم اور آقا اور غلام کو یکساں محبت و اخوت کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔

حاکم مصر حضرت عمروؓ بن العاص کے بیٹے نے ایک دفعہ ایک مصری کو بلا وجہ کوڑے سے پیٹا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مصری کو اس سے بدلہ لینے کا حکم دیا اور عمروؓ بن العاص کے بیٹے سے کہا تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنا لیا حالانکہ وہ اپنی ماں کے پیٹ سے آزاد پیدا ہوئے ہیں۔"

آج نسلی خرخشوں اور وطنی و لسانی جھگڑوں کو مٹانے کے لیے مغرب کے مفکّرین عالمی حکومت" کا تصور پیش کر رہے ہیں لیکن یہ خواب اس وقت تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ جب تک دنیا وحدتِ الٰہ اور وحدتِ آدم کے انقلاب انگیز نظریہ کی قائل نہ ہو جائے۔

یہ توحید ہی ہے جو دنیا کے لیے اجتماعیت کے صحیح خطوط فراہم کرتی ہے اور جس پر ایمان لانے والا ہر شخص اپنے آپ کو ایک عالم گیر برادری کا رکن تصوّر کرتا ہے۔

مُدّعائے ما مآلِ مایکیست	طرز و اندازِ خیالِ مایکیست

ما ز نعمتہائے او اخواں شدیم	یک زبان و یکدل و یکجاں شدیم

(ہمارا مدعا و مقصود ہمارے طور طریقے اور اندازِ خیال سب ایک ہیں ہم اس کی تعلیمات کی وجہ سے بھائی بھائی بن چکے ہیں۔ ہم یک زبان، یک دل اور یک جان ہیں)

دوسرا باب

رسالت

از رسالت در جہاں تکوینِ ما
از رسالت دینِ ما آئینِ ما

از رسالت صد ہزار ما یک است
جُزوِ ما از جُزوِ ما لاینفک است

فصل ۱

سیدھی راہ کی سمت رہنمائی

اگر ہم اپنے اردگرد پھیلے ہوئے جہانِ رنگ و بُو پر نگاہ ڈالیں اور اپنے وجود کا جائزہ لیں تو ہمارا دل بے اختیار گواہی دے گا کہ ہمارا خالق ہم پر بے حد شفیق و رحیم ہے اور اس کی رحمتیں ہمیں ہر آن گھیرے ہوئے ہیں۔ اس نے ہماری جملہ ضروریات کو پورا کرنے کا سامان بہم پہنچایا ہے۔ ہمیں طرح طرح کی نعمتوں سے نوازا ہے۔ ہمیں دیکھنے کو آنکھیں، سننے کو کان اور بولنے کو زبان عطا فرمائی ہے، چاند، سورج، ستاروں ہوا اور پانی کو ہماری چاکری پر مامور کیا ہے اور عقل، ارادہ اور شعور بخش کر ہمیں اشرف المخلوقات کا درجہ دیا ہے۔

کون کہہ سکتا ہے کہ جو خدا اتنا رحیم و کریم ہے اور جس نے انسانی ضروریات کو پورا کرنے کا اتنا اہتمام کیا ہے وہ انسان کو یہ بتانے اور سمجھانے کا انتظام نہیں کرے گا کہ زندگی گزارنے کا سیدھا راستہ کون سا ہے؟ آپ مجھ سے اتفاق کریں گے

کہ انسان کی ضروریات فقط خورد و نوش تک محدود نہیں ہیں۔ یہ ضروریات تو فقط اس جانور کی ہیں جسے انسانی جسم کہا جاتا ہے۔ اس جسم کے اندر جو انسان چھپا ہوا ہے وہ کچھ اور بھی چاہتا ہے اور وہ "کچھ اور" یہ ہے کہ میں اپنی انسانیت کو کس طرح ترقی دوں، پاکیزہ اور صاف ستھری زندگی کیسے گزاروں، اپنے خالق کی منشاء کے مطابق تعمیرِ حیات کیسے کروں اور فکر و نظر کی ان ٹیڑھی ترچھی پگڈنڈیوں میں صراطِ مستقیم کا سراغ کیسے لگاؤں؟ اس کے اندر کا انسان دیکھتا ہے کہ زمانہ زندگی کا متلاشی ہے اور اس پر جی جان سے فدا ہے تو اس کا شعور سوال کرتا ہے کہ آخر اس زندگی کا مقصد کیا ہے؟

زمانہ چاہتا ہے زندگی کو   مگر خود زندگی کیا چاہتی ہے

اگر اللہ تعالیٰ انسان کی اس سب سے بڑی ضرورت کو پورا نہ کرے تو اس کی صفتِ رحمت کی تکمیل نہیں ہوتی اگر وہ دنیا کو یونہی اندھیروں میں بھٹکتا چھوڑ دے اور اس کی دست گیری نہ کرے تو یہ اس کی شانِ رحمت کے منافی ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کی اس ضرورت کو بھی پورا کیا ہے اور زندگی کا سیدھا رستہ بتانے کی ذمہ داری خود قبول فرمائی ہے۔

وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ   اور اللہ ہی کے ذمہ ہے سیدھا راستہ
وَمِنْهَا جَآئِرٌ (النحل)   بتانا جب کہ راستے ٹیڑھے بھی موجود ہوں۔

اور انسانیت کو صراطِ مستقیم دکھانے کے لیے جو واسطہ خدا نے تجویز فرمایا ہے اسی کا نام رسالت ہے۔

فصل ۲

رسالت
کی
ضرورت

ہم مجرّد عقل کی روشنی میں اس نتیجے پر تو پہنچ سکتے ہیں کہ خدا ہے اور اسی نے ہمیں پیدا کیا ہے۔ لیکن خدا سے متعلق باقی تفصیلات معلوم کر سکنا ہمارے بس کی بات نہیں۔ خدا ہے تو اس کا ہمارے ساتھ کیا تعلّق ہے۔ اس کی پسند اور ناپسند کیا ہے۔ وہ کن باتوں پر خوش ہوتا ہے اور کن باتوں پر ناخوش۔ مرنے کے بعد کیا ہونے والا ہے؟ — یہ سارے سوالات ہمارے لیے عقدۂ لاینحل ہیں۔ قیاسات کے تیرتکّے لڑا کر اٹکل پچو ہم ان کا جواب حاصل کرنے کی کوشش کریں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر شخص اس معاملے میں اپنا ایک الگ نظریہ گھڑے گا۔ وحدتِ فکر ختم ہو جائے گی اور انسانیت ایک ایسے انتشارِ ذہنی میں مبتلا ہو جائے گی جس کے بعد اس کا شیرازہ منتشر ہو کر رہ جائے گا۔ اس نقصانِ عظیم کے ساتھ ساتھ یقین ہمارے دلوں سے رخصت ہو جائے گا اور ہم میں سے کوئی آدمی اس بات پر مطمئن نہیں ہو گا کہ اس نے ان سوالات کا جو حل تلاش کیا ہے وہ فی الواقع درست اور معقول ہے — علامہ اقبال مرحوم

نے اسی لیے کہا۔

خرد سے راہرو روشن بصر ہے — خرد کیا ہے چراغِ راہگزر ہے
درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا — چراغِ رہ گزر کو کیا خبر ہے

آپ غور کریں گے تو ان سوالات کا جواب حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ آپ کی سمجھ میں آئے گا اور وہ یہ ہے کہ کسی ایسے واسطہ کو تلاش کیا جائے، جسے براہِ راست ان حقائق کا علم ہو۔ ہم روزمرّہ کے معاملات میں بھی اسی طریقہ پر عمل پیرا ہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ ہماری بیماری کس طرح رفع ہوگی۔ اس لیے ہم اس سلسلے میں ڈاکٹر پر اعتماد کرتے ہیں کیونکہ وہ ہمارے نزدیک اس فن کا ماہر ہوتا ہے۔ ہم کوئی مقدمہ دائر کرتے ہیں تو اس کے لیے وکیل تلاش کرتے ہیں کیونکہ وہ قانون کی باریکیوں سے پوری طرح واقف ہوتا ہے۔ آج سائنس دانوں کے انکشافات پر بھی ہم اس لیے صاد کرتے ہیں کیونکہ ہم انھیں ان رموز و اسرار کا عالم تسلیم کرتے ہیں۔ اسی طرح دانش مندی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم خدا کے معاملے میں بھی کچھ ایسی شخصیتوں پر اعتماد کریں۔ جنھیں خدا تعالیٰ نے خود ان سوالوں کا جواب بتایا ہو اور یہی وہ شخصیتیں ہیں جنھیں نبی اور رسول کہا جاتا ہے۔

آپ انبیاء کی تاریخ کا مطالعہ کریں کوئی نبی اور رسول ایسا نہیں ہے جس نے یہ کہہ کر لوگوں کو اپنے اوپر ایمان لانے کی دعوت دی ہو کہ میں عقل میں تمھاری رہنمائی کروں گا۔ جو آیا اس نے یہی کہا۔

وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰہِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (الاعراف) — "اور مجھے اللہ کی طرف سے وہ کچھ معلوم ہے جو تمھیں معلوم نہیں ہے۔"

ان کے متعلق خالقِ کائنات نے بھی شہادت دی۔

وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی — "وہ جو کچھ بولتا ہے اپنی خواہش سے

إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ۔ نہیں بولتا بلکہ وہ تو وحی ہے جو وحی کی جا رہی ہے۔"

اس لیے انسانیت کے لیے واحد چارۂ کار یہ ہے کہ وہ ان پاکیزہ ہستیوں پر ایمان لائے اور عقل کی بھول بھلیوں میں گم ہونے کی بجائے اس علمِ حقیقی سے فیض یاب ہو جو انبیاء کی وساطت سے اسے حاصل ہوا ہے۔

فصل ۳

سلامتی
کی
راہ

اس بات کو کہ پیغمبر براہِ راست خدا سے علم حاصل کرتے ہیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک واقعاتی تمثیل سے واضح فرمایا ہے۔ عرب میں دستور تھا کہ جب کوئی شخص دشمن کے حملہ کی اطلاع اپنے اہلِ وطن کو دینا چاہتا تو ایک اونچی جگہ کھڑے ہو کر "واصباحاہ" پکارتا اور لوگ خطرے کو بھانپ کر اس شخص کی طرف دوڑ پڑتے۔ جب آنحضورؐ نے نبوت کا دعویٰ کیا تو ایک دفعہ آپ نے بھی یہی طریقہ اختیار فرمایا۔

کوہِ صفا پر چڑھ کر آپ نے لوگوں کو آواز دی۔ جس کسی نے یہ آواز سنی اوہ بے تحاشا کوہِ صفا کو دوڑا۔ آج لوگ اس لیے بھی تیزی دکھا رہے تھے کہ انھیں یہ محسوس ہو رہا تھا کہ معاملہ کچھ بہت ازیادہ اہم ہے تبھی اس شخصیت کو اطلاع دینے کی ضرورت محسوس ہوئی جو ہم میں سب سے زیادہ راستباز اور امین و دیانت دار ہے جب سب لوگ صفا کے دامن میں جمع ہو گئے تو حضورؐ نے پوچھا۔ "لوگو! تم میرے متعلق کیا رائے رکھتے ہو؟" جواب دیا گیا "ہم آپ کو صادق اور امین سمجھتے ہیں۔ آپ سے بڑھ کر

صادق الوعد آدمی ہماری نظر سے نہیں گزرا۔" حضورؐ نے فرمایا۔" اگر میں یہ کہوں کہ اس پہاڑی کے پیچھے دشمن کا لشکر چھپا ہوا ہے۔ اور وہ آن کی آن میں تم پر حملہ کیا چاہتا ہے تو کیا تم اس بات کو مان لو گے۔" قریش مکہ نے دیکھا کہ جو ہستی یہ بات فرما رہی ہے اس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا اور پھر وہ ایک ایسے بلند مقام پر کھڑی ہے کہ پہاڑ کے دونوں طرف اس کی نگاہ جا رہی ہے اور ہم دامنِ کوہ میں ہیں اور پہاڑ کی دوسری جانب دیکھنے سے قاصر ہیں تو انھوں نے بیک زبان جواب دیا۔" اے محمدؐ ہم اس بات کو ضرور مان لیں گے۔" حضورؐ نے جب اپنے مقام کا یہ اعتراف کرا لیا تو اب اس خطرے کی اطلاع دی جس کے لیے آپ نے انھیں جمع کیا تھا فرمایا تو" اے لوگو! میں تمھیں خدا کے عذاب سے ڈراتا ہوں۔"

سبحان اللہ! پیغمبرؐ کا مقام بلند واضح کرنے کے لیے آپ نے کیا دل نشین اسلوب اختیار فرمایا۔ عام انسان دامنِ کوہ میں کھڑے ہیں۔ درمیان میں زندگی کا پہاڑ حائل ہے وہ دیکھنا بھی چاہیں کہ اس پہاڑ کے پیچھے کیا ہے تو نہیں دیکھ سکتے۔ ان کی نگاہ فقط پہاڑ سے ادھر ہی ادھر کام کرتی ہے مگر پیغمبر ایک ایسی جگہ کھڑا ہے جہاں پہاڑ کے دونوں طرف کا حال پوری طرح روشن ہے۔ وہ زندگی سے بھی باخبر ہے اور اس زندگی کے بعد جو کچھ ہونے والا ہے اسے بھی خوب جانتا ہے اور پھر کردار کے لحاظ سے اتنی اونچی شخصیت کا مالک ہے کہ اس کے دامن پر کوئی داغ دھبہ نظر نہیں آتا۔ اب ہمارے لیے سلامتی کا راستہ کیا ہے؟ کیا یہ کہ ہماری نگاہوں کے آگے زندگی کا جو پہاڑ حائل ہے اس کے پیچھے کے احوال جاننے کے لیے اپنے اندازے اور قیاس پر انحصار کریں یا ان ہستیوں کی بات مانیں جو ایسے بلند مقام کی حامل ہیں کہ پہاڑ کے اس پار کے معاملات سے اچھی طرح واقف اور آگاہ ہیں۔

" سوچیے اور سوچنے کے بعد جواب دیجیے کہ ہمارے لیے سلامتی کا راستہ کون سا ہے۔"

CENTRAL URDU LIBRARY
URDU HALL HIMAYATNAGAR
HYDERABAD-500029

فصل ۴

انبیاء کی صداقت

دنیا کو راہِ راست پر لانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے جتنے بھی انبیاء مبعوث فرمائے ہیں، وہ سب کے سب اتنے اونچے کردار کے مالک تھے کہ دوست تو دوست دشمن بھی اس پہلو سے ان پر کوئی حرف گیری نہ کر سکے بلکہ مجبوراً اگر اظہارِ رائے کرنا پڑ گیا تو بے اختیار ان کی زبان سے تعریف و توصیف کے کلمات اُبل پڑے۔ آدمی اگر غور کرے تو انبیاء کی یہ پاکیزہ سیرت ہی ان پر ایمان لانے کے لیے کافی ہے۔ ابوسفیان قیصرِ روم کے دربار میں پہنچا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اس سے مدد حاصل کرے یہ بڑا ہی نازک موقع تھا مگر یہاں بھی پیغمبر کی صداقت اور دیانت کا اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکا۔ بادشاہِ روم نے پوچھا کیا محمدؐ پر کبھی جھوٹ کی تہمت بھی لگی ہے؟ ابوسفیان نے کہا نہیں۔ پھر اُس نے پوچھا، کیا انھوں نے کبھی اپنا عہد توڑا ہے۔ ابوسفیان بولا نہیں۔ اس پر قیصرِ روم بے اختیار پکار اٹھا کہ جو شخص لوگوں کے ساتھ جھوٹ نہیں بولتا وہ خدا پر کس طرح جھوٹ باندھ سکتا ہے۔

سوچنے کی بات ہے کہ آخرت کے بارے میں انبیاء نے جو اطلاع دی ہے اس میں ان کا کیا ذاتی فائدہ پوشیدہ تھا؟ اگر انھیں عزت اور منزلت کی ضرورت ہوتی تو وہ نبوت کا دعویٰ

کرنے سے پہلے ہی انھیں حاصل تھی۔ لوگ ان کے رستے میں آنکھیں بچھاتے تھے اور ایک بہترین انسان کی حیثیت سے ان پر اعتماد کرتے تھے۔ یہ اطلاع دینے کا نتیجہ تو ہمیشہ یہ نکلا کہ انھیں بے انتہا مظالم کا سامنا کرنا پڑا۔ بعض کو آروں سے چیر ڈالا گیا۔ بعض کو جلاوطن کر دیا گیا۔ کتنوں کو قتل کر دیا گیا اور کتنے ہی ایسے تھے جو دنیا میں کامیابی کا منہ دیکھے بغیر اپنے خالق سے جا ملے۔ لیکن انھوں نے لوگوں کے سامنے جو دعوت پیش کی تھی۔ ان سارے مظالم کے باوجود اس سے باز نہیں آئے۔ انھیں لالچ دی گئی۔ سیم وزر اور حسن و جمال کی پیشکش کی گئی، حکومت اور سلطنت دینے کے وعدے کیے گئے مگر ان پاکباز ہستیوں نے ان سب چیزوں کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیا۔ آپ غور کریں گے تو ان باتوں سے اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ یہ بے لوث اور بے غرض پاکباز ہستیاں خدا کی طرف سے ہی بھیجی گئی تھیں اور ان کے پیش کردہ حقائق میں ذرہ برابر شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

پھر یہ ایک لاکھ چوبیس ہزار ہستیاں کسی ایک عہد میں پیدا نہیں ہوئیں بالکل مختلف، زمانوں اور مختلف ادوار میں ان کی بعثت ہوئی اس کے باوجود ان کی دعوت میں کوئی تضاد اور اختلاف نہیں پایا جاتا۔ آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء کی دعوت میں حیرت انگیز مطابقت نظر آتی ہے۔ دنیا کے دوسرے تمام نظریات ہر زمانے میں بدلتے رہے ہیں، کل تک سائنس دان نظریۂ ارتقاء پر ایمان رکھتے تھے مگر آج بہت سوں کے نزدیک اسے تسلیم کرنا "جرم" سے کم نہیں مگر انبیائے کرام نے توحید، رسالت، معاد، تقدیر اور ملائکہ سے متعلق جو امور پیش فرمائے وہ کسی عہد میں تبدیل نہیں ہو سکے۔

روزمرہ کی زندگی میں اگر چند آدمی ہمارے سامنے کسی بات کو وثوق سے بیان کر دیں تو ہم اس کو صحیح ماننے میں تامل نہیں کرتے مگر یہاں ایک لاکھ چوبیس ہزار پاکیزہ ہستیاں ایک عظیم الشان تواتر اور تسلسل سے ہمارے سامنے کچھ حقائق رکھتی ہیں مگر ہم ان پر ایمان لانے میں لیت و لعل کی روش اختیار کرتے ہیں۔

ع ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے

فصل ۵

امام غزالی کا اِستدلال

توحید کی طرح نبوّت کے معاملے میں بھی "عقل پرست" طبیعت کو یہ مشکل پیش آتی ہے کہ "غیب" سے متعلق جو خبریں نبی دے رہا ہے وہ انھیں اپنی محدود عقل کے ذریعے جانچنا چاہتی ہے۔ اسے یہ اشتباہ ہوتا ہے کہ جب ہم عقل اور ذاتی سوچ بچار کے ذریعے ان امور کا احاطہ نہیں کر سکتے تو پھر آخر وحی کیا چیز ہے کہ جس کے ذریعے یہ معلومات پیش کی جارہی ہیں۔ حضرت امام غزالیؒ نے اس شبہ کو بہت خوبصورتی سے صاف کیا ہے۔ انھوں نے اس سلسلہ میں خواب کی مثال پیش کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر ہم سے یہ کہا جائے کہ جب ہماری بینائی، سماعت اور دوسرے سارے قوائے حسی کام نہیں کرتے اور ہم بالکل بے ہوش اور غافل ہو جاتے ہیں تو اس وقت ہم پر بعض اوقات ہونے والے واقعات کا انکشاف ہوتا ہے اور ہم تمثیل کے رنگ میں مختلف حقیقتوں کا مشاہدہ کرتے ہیں — تو ہم میں سے ہر شخص اس بات کو خلافِ عقل ٹھہرائے گا اور اس پر یہ دلیل لائے گا کہ قوائے حسی کے ذریعے ہی تو ادراک و احساس ہوتا ہے اور جب یہ معطّل و بے کار ہو جائیں تو پھر مشاہدہ کیسا؟ حضرت

امام فرماتے ہیں کہ عقل کی رو سے یہ اعتراض ضرور وارد ہوتا ہے۔ مگر ہمارا روزمرہ کا تجربہ گواہی دیتا ہے کہ انسان عالمِ خواب میں عین بے ہوشی اور غفلت کے عالم میں ایسے ایسے واقعات دیکھتا ہے کہ جو آئندہ زندگی میں حرف بحرف سچے نکلتے ہیں اور تمثیل کے رنگ میں اسے کتنے مشاہدے ہوتے ہیں جنھیں تعبیر کے ذریعے سمجھا جا سکتا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ احساس وادراک کے تعطّل کے باوجود خبر رسانی کا کوئی اور ذریعہ موجود ہے۔ امام غزالیؒ یہاں پہنچ کر دلیل پیش فرماتے ہیں کہ اسی طرح نبوت ایک ایسے مقام کا نام ہے جہاں عقل کچھ کام نہیں کرتی مگر نبی پر اس کی بدولت وہ امورِ غیب روشن ہو جاتے ہیں جو انسانی فہم وادراک کی دسترس سے باہر ہیں، عقل بے چاری ان سرحدوں پہ یہ کہہ کر ساتھ چھوڑ دیتی ہے کہ

اگر یک سرِ موئے برتر پرم ۔۔۔ فروغِ تجلّی بسوزد پرم

ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ میں جب تک اس مقام کو نہ دیکھ لوں اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں لیکن امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ یہ ایسی ہی بات ہو گی جیسے ایک اندھا اس پہ اصرار کرے کہ وہ جب تک مختلف رنگوں کو دیکھ نہیں لے گا ان کا وجود تسلیم نہیں کرے گا۔

قرآن نے بھی کہا۔

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآىِٕنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَیْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّیْ مَلَكٌ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰۤى اِلَیَّ قُلْ هَلْ یَسْتَوِی الْاَعْمٰى وَالْبَصِیْرُ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ۔

(الانعام)

"اے محمدؐ ان سے کہو۔ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں، نہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔ میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر نازل کی جاتی ہے۔" پھر ان سے پوچھو۔ کیا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہو سکتے ہیں؟ کیا تم غور نہیں کرتے۔

فصل ۶

انبیاء کا منصب

اگر کوئی شخص اپنے نوکر کو اپنی پسند ناپسند بتلائے بغیر اور یہ سمجھائے بغیر کہ وہ کون سی باتوں پر خوش ہوتا ہے اور کون سی باتوں پہ ناراض اور اس کے کیا فرائض ہیں اسے سزا دے اور اس کی غلطیوں کو قابلِ مواخذہ سمجھے تو ہر معقول آدمی اسے بعید از انصاف قرار دے گا۔ اسے سزا دینے کے لیے ضروری ہے کہ ہم پہلے یہ ساری باتیں نوکر کو خوب اچھی طرح سمجھا دیں اور اگر اس کے بعد بھی وہ کوئی غلط رویہ اختیار کرے تو پھر اسے سرزنش کریں ۔۔۔ اس مثال کو ذہن میں رکھتے ہوئے اب آپ خدا اور بندوں کے تعلق پر غور کریں، فرض کیجیے اگر اللہ تعالیٰ ہمیں ہمارے فرائض سے مطلع کیے بغیر سزا دیتا تو وہ اس پر قادر تو ضرور تھا مگر یہ بات اس کے عدل و انصاف کے منافی ہوتی اور ہم یہ عذر پیش کرنے کے مجاز ہوتے کہ جب ہم پر حق واضح ہی نہیں کیا گیا تو پھر یہ زجرو توبیخ کیسی؟ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاؑء مبعوث فرمائے تاکہ ہم پر ہر طرح اتمامِ حجت ہو جائے۔

قرآنِ حکیم میں اسی سلسلے میں فرمایا گیا۔

اگر اللہ تعالیٰ پیغمبر اتارنے سے قبل ہی کسی عذاب سے ان کو ہلاک کر دیتے تو وہ ضرور

بہ عذر کرتے کہ ہمارے پروردگار تو نے ہمارے پاس کوئی رسول کیوں نہ بھیجا کہ ذلیل و رسوا ہونے سے پہلے ہم تیرے حکموں پر چلتے۔ اسی لیے فرمایا۔ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا۔ ہم عذاب نہیں دیتے جب تک کہ اپنا کوئی رسول نہ بھیج دیں۔

پھر انبیاء تشریف لاتے ہیں تو ان کی حیثیت محض ایک پیغام بردار قاصد کی نہیں ہوتی بلکہ وہ دنیا میں خدا کے مقرر کردہ نمائندے ہوتے ہیں جو ان سے کٹتا ہے خدا ان سے کٹ جاتا ہے اور جو ان سے جڑتا ہے وہ دراصل خدا سے اپنا تعلق جوڑتا ہے ان کی اطاعت اور فرماں برداری خدا کی فرمانبرداری ہوتی ہے اور ان کی نافرمانی خدا کی نافرمانی۔

دنیا میں بھی آپ دیکھ لیجیے ایک شخص بادشاہ کا لاکھ وفادار بنتا ہو مگر اس کے مقرر کردہ نمائندہ کو ماننے سے انکار کر دے تو یہ انکار بادشاہ کو نہ ماننے کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص بادشاہ کے نمائندہ کی اطاعت کرتا ہے تو اسے خود بادشاہ کی اطاعت پر محمول کیا جاتا ہے۔ اسی بات کو امام رازیؒ نے اس طرح بیان فرمایا ہے۔

"جس نے نبوت اور رسالت کا انکار کیا درحقیقت وہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ پاک کی معرفت ہی سے بے نصیب رہا۔"[1]

نصاریٰ کی مثال آپ کے سامنے ہے انھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مقام پہچاننے میں ٹھوکر کھائی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خدا کے معاملے میں بھی گم کردہ راہ ہو گئے اور "ایک میں تین اور تین میں ایک" کے چکر میں پڑ گئے۔ تاریخِ عالم گواہ ہے کہ جس قوم نے اپنے نبی کی تعلیمات کو فراموش کر دیا، یا اس کی حیثیت کے متعلق افراط و تفریط میں مبتلا ہو گئی تو حقیقت کا سرا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ خدا کے متعلق بے بنیاد فلسفوں اور نظریات میں پھنس کر رہ گئی۔

دین کی عمارت میں انبیاء کی معرفت سنگِ بنیاد کا حکم رکھتی ہے اور جب آپ اسے ہی ہاتھ سے دے بیٹھیں تو پھر یہ عمارت مستحکم ہو چکی۔

خشتِ اول چوں نہد معمار کج　　　تا ثریا مے رود دیوار کج

---

[1] تفسیر کبیر جلد ۲ ص ۱۲۸

فصل ۷

انبیاءؑ آدمی تھے

اسلام میں رسول کے متعلق نہ تو یہ عقیدہ ہے کہ وہ خدا کا اوتار ہوتا ہے اور نہ یہ کہ اس کے بھیس میں خود خدا جلوہ نما ہے۔ اسلام بہت صاف اور واضح طریقے سے انبیاء کی بشریت کا عقیدہ دیتا ہے۔ نصاریٰ نے تو حضرت مسیح کو بن باپ کے پیدا ہوتے دیکھا تو وہ آپ کے "ابن اللہ" ہونے کے بے بنیاد وہم میں مبتلا ہو گئے مگر آدم علیہ السلام بغیر ماں اور باپ کے تولّد ہوتے ہیں اور اسلام ان کے ابوالبشر ہونے کا اعلان کرتا ہے۔

اعجوبہ پسند طبیعتوں نے ہر دور میں انبیاء کی بشریت کا انکار کیا ہے۔ مگر انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ اگر انبیاء بشر نہیں تھے تو پھر کس مخلوق سے تعلق رکھتے تھے؟ خدا تو وہ ہو نہیں سکتے کہ وہ اس طرح کی ہر شراکت سے بے نیاز اور منزّہ اور مبرّا ہے۔ فرشتوں کی طرف انھیں اس لیے منسوب نہیں کیا جا سکتا کہ انسان خود اس مخلوق سے افضل ہے۔ ان کے ہوتے ہوئے آدمؑ کو خلافت کی فضیلت کا حق دار ٹھہرانے میں یہی نکتہ پوشیدہ تھا۔ پھر آخر انھیں کس مخلوق سے نسبت دی جائے گی؟ اصل میں بات یہ ہے کہ غافل انسان ہر زمانے میں اس حقیقت کو فراموش کر جاتا رہا کہ اس کا لقب اشرف المخلوقات ہے اور کائنات میں حق تعالیٰ نے اس

کو سزاوارِ نیابت سمجھا ہے۔ یہ خصوصیت نسلِ انسانی ہی کو عطا کی گئی تھی کہ اس کے اندر سے انبیاء اور پیغمبر اٹھائے گئے مگر یہ اس کی بہت بڑی بد قسمتی ہے کہ اس کے اندر کے چند جہالت پسند افراد نے اس بات کو سرمایۂ افتخار سمجھنے کی بجائے الٹا انبیاء کو کسی اور مخلوق سے منسوب کرنا شروع کر دیا۔

پیغمبر نوعِ انسانی کے رہنما بن کر آتے ہیں لیکن اگر وہ انسان ہی نہ ہوں تو پھر وہ کس طرح ایک کامل انسانیت کا نمونہ بن سکتے ہیں؟ اگر وہ غم سے ناآشنا ہوں تو غمزدوں کا سہارا کیسے بنیں؟ بھوک اور پیاس کی تکلیف سے ناواقف ہوں تو بھوکوں اور پیاسوں کے درد کا مداوا کیسے بنیں؟ وہ خود چوٹ نہ کھا سکتے ہوں تو پھر چوٹ کھائے ہوئے دلوں کا آسرا کیسے ہوں؟ —— اگر وہ بشر نہ ہوں تو ہم خدا کے حضور یہ عذر کر سکتے ہیں کہ جس شریعت پر یہ عمل پیرا ہیں ہم اس پر نہیں چل سکتے —— یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے انہی کے اندر سے پیغمبر مبعوث فرمائے تاکہ یہ عذر ہی باطل ہو جائے۔

قرآنِ حکیم میں انبیاء کی بشریت کے متعلق متعدد آیات میں تصریح کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ۔	کیا تمھیں اس بات پر تعجب ہوا کہ تمھارے پاس خود تمھاری اپنی قوم کے ایک آدمی کے ذریعہ سے تمھارے رب کی یاد دہانی آئی تاکہ تمھیں خبردار کرے، تاکہ تم متقی بنو اور تم پر رحم کیا جائے۔
(اعراف)	

سورۂ یوسف میں ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ	"اے محمد! تم سے پہلے ہم نے جو پیغمبر

قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْ اِلَیْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰی ؕ	بھیجے تھے وہ سب بھی انسان ہی تھے اور انھی لبتیوں کے رہنے والے تھے۔
سورۂ ابراہیم میں فرمایا۔	
قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَمُنُّ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ	رسولوں نے کہا۔ واقعی ہم کچھ نہیں مگر تم جیسے انسان لیکن خدا اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے سرفراز فرماتا ہے۔

فصل ۸

شرطِ نجات

ایک روایت کے مطابق آدم علیہ السلام سے لے کر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر دنیا میں تشریف لائے ہیں۔ مگر جن انبیاء کے نام صحائف اور تواریخ میں محفوظ رہ گئے ہیں، ان کی تعداد میں بھی حضورؐ کے سوا کوئی نبی اور رسول ایسا نہیں ہے جس کی شریعت کسی تحریف اور تبدیلی کے بغیر اپنی اصل شکل میں موجود ہو۔ عیسائیت کا شمار دنیا کے چند بڑے مذاہب میں ہوتا ہے، مگر اس کی کتاب مقدس کے تاریخی مقام اور مرتبہ کا حال یہ ہے کہ متعدد چھوٹی بڑی انجیلوں میں سے آج عیسائیوں کی عظیم اکثریت صرف چار انجیلوں کو معتبر تسلیم کرتی ہے اور یہ چار انجیلیں بھی وہ ہیں جن کے مصنفین نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیکھا تک نہیں، یہ روایات انھیں کہاں سے معلوم ہوئیں، یہ بات بھی نامعلوم ہے۔ بلکہ حد یہ ہے کہ اب تو یہاں تک شبہ کیا جارہا ہے کہ جن افراد کی طرف ان چار انجیلوں کو منسوب کیا گیا ہے وہ فی الواقع ان کے مرتب ہیں بھی کہ نہیں۔ انجیل کی اسی تاریخی حیثیت کو دیکھتے ہوئے بعض امریکی نقادوں نے تو یہاں تک جسارت کی ہے کہ وہ حضرت مسیح کے وجود میں بھی شک کرنے لگے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک دوسرے جلیل القدر نبی ہیں لیکن ان سے جس کتاب کو منسوب کیا جاتا ہے انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا کے مصنفین کے بقول وہ آپ کے سینکڑوں سال بعد لکھی گئی ہے۔ یہ انہی باتوں کا نتیجہ ہے کہ آج انجیل اور تورات میں متعدد ایسے مقامات پائے جاتے ہیں جنھیں انبیاء کی طرف منسوب کرنا ان کی توہین کرنا ہے۔ ان کتابوں میں العیاذ باللہ ان نفوس قدسیہ پر بدکاری تک کے اتہامات عائد کیے گئے ہیں جنھیں پڑھنے کے بعد عقل سلیم فریاد کر اٹھتی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ صحائفِ آسمانی تحریف کی نذر کیوں ہو گئے؟ جب ہم قرآن کی روشنی میں اس سوال پر غور کرتے ہیں تو اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ سب کے سب انبیاء کسی خاص وقت، کسی خاص قوم اور کسی خاص ملک کے لیے مبعوث ہوئے تھے ان کی شریعتیں عالمگیر نہیں تھیں، اور نہ ان کے بقاء و دوام کی ضرورت تھی اسی لیے یہ بتدریج تحریفات کا شکار ہو گئیں۔ حتیٰ کہ وہ آیا جس کے متعلق قرآن نے اعلان کیا۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَاۨ الَّذِىْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (الاعراف - ۱۵۸)

اے محمدؐ! کہو کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف اس خدا کا پیغمبر ہوں جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے۔

اسے دنیا بھر کے انسانوں کے لیے ہادی اور رہنما بنا کر بھیجا گیا وہ مغرب کے لیے بھی آیا اور مشرق کے لیے بھی۔ عرب کے لیے بھی آیا اور عجم کے لیے بھی۔ دنیا کے تمام انسانوں کے لیے اس پر ایمان لانا شرطِ نجات قرار دیا گیا۔ یہاں تک کہ حق تعالیٰ نے تمام انبیاء سے یہ عہد لیا کہ اگر وہ ان کے عہد میں آجائے تو اس پر ایمان لائیں اور اس کی مدد کریں۔

قرآن کہتا ہے:۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ (آل عمران)

اور جب کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء سے یہ عہد لیا تھا کہ جب میں تمھیں کتاب و حکمت دوں پھر تمھارے پاس خدا کا ایک رسول آئے، جو تمھارے پاس والی کتاب کی تصدیق کرنے والا ہو تو اس پر ایمان لانا اور اس کی نصرت و مدد کرنا

فصل ۹

حضورؐ پر ایمان ضروری ہے

بعض حضرات کے نزدیک حضورؐ پر ایمان لانا نجات کے لیے لازمی شرط نہیں وہ سمجھتے ہیں کہ اگر کوئی آپ کی بعثت کے بعد بھی حضرت عیسیٰؑ اور حضرت موسیٰؑ کی شریعت پر عمل پیرا رہے تو قیامت کے روز اس سے مواخذہ نہیں ہوگا افسوس یہ ہے کہ ہندوستان کے بعض علماء نے بھی کچھ اس سے ملتی جلتی رائے کا اظہار کیا ہے۔ لیکن قرآن و حدیث اور خود آپ کے اور صحابہ کے عمل سے اس نظریہ کی مکمل تردید ہوتی ہے۔

حضرت جابرؓ کی روایت ہے حضورؐ نے فرمایا۔

لَا تَسْأَلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ	اہلِ کتاب سے دین کی کوئی بات مت
عَنْ شَيْءٍ فَإِنَّهُمْ لَنْ	پوچھا کرو کیونکہ جو خود گمراہ ہو چکے ہیں وہ
يَهْدُوكُمْ وَقَدْ ضَلُّوا	بھلا تمھیں کیا راہ دکھائیں گے۔ اگر تم
فَإِنَّكُمْ إِمَّا أَنْ تُصَدِّقُوا	ان کی تصدیق کرتے ہو تو احتمال ہے کہ تم
بِبَاطِلٍ أَوْ تُكَذِّبُوا	کسی غلط بات کی تصدیق کر بیٹھو اور اگر

بِحَقٍّ فَإِنَّهُ لَوْ كَانَ مُوسٰى حَيًّا بَيْنَ اَظْهُرِكُمْ مَا حَلَّ لَهُ اِلَّا اَنْ يَّتَّبِعَنِیْ۔ (مسند احمد)

تکذیب کرتے ہو۔ تو ممکن ہے کسی حق بات کی تکذیب کر دو، آج وہ زمانہ ہے کہ اگر خود موسیٰ علیہ السلام تم میں زندہ موجود ہوتے تو انھیں بھی سوائے میری پیروی کے تورات کی پیروی کرنا حلال نہ ہوتا۔

قرآنِ حکیم نے ان لفظوں میں اہلِ کتاب کو حضورؐ پر ایمان لانے کی دعوت دی۔

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ (الاعراف)

جو اس پیغمبر، نبیِ امی کی پیروی اختیار کریں جس کا ذکر انھیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے۔

قرآن نے دعویٰ کیا کہ جو لوگ کتبِ آسمانی کا علم رکھتے ہیں وہ حضور کی رسالت کے منکر نہیں ہو سکتے۔ سورۂ رعد میں کہا گیا۔

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا ؕ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۢ بَيْنِیْ وَبَيْنَكُمْ ۙ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ۠

یہ منکرین کہتے ہیں کہ تم خدا کے بھیجے ہوئے نہیں ہو کہو۔ میرے اور تمھارے درمیان اللہ کی گواہی کافی ہے اور پھر ہر اس شخص کی گواہی جو کتابِ آسمانی کا علم رکھتا ہے۔

مذکورہ آیات اس امر کی دلیل ہیں کہ حضور کی بعثت کے بعد عیسائیوں اور یہودیوں سمیت ہر شخص کے لیے ضروری ہے کہ وہ آپ پر ایمان لائے۔ خود تورات اور انجیل میں ہزار تحریفات کے باوجود آج بھی وہ واضح اشارات موجود ہیں جن میں حضورؐ کی آمد کی بشارت دینے کے بعد آپ کی پیروی کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ حضرت امام ابنِ تیمیہؒ

---

[1] جو احباب اس سلسلہ میں تفصیلات کے طالب ہوں۔ وہ ہماری کتاب "آئینۂ تثلیث" ملاحظہ فرمائیں۔

نے ایسی تمام پیشین گوئیوں کو تشریح کے ساتھ اپنی ایک کتاب میں جمع کر دیا ہے جن کو پڑھنے کے بعد ان "کتاب خوانوں" کی قسمت پر آنسو بہانے کو جی چاہتا ہے جو ان شہادتوں کے باوجود بھی نعمت اسلام سے محروم ہیں۔

تورات استثناء باب اٹھارہ آیت ۱۵ میں ہے۔

"خداوند تیرا خدا تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے تیرے ہی بھائیوں میں میری مانند ایک نبی برپا کرے گا۔ تم اس کی طرف کان دھریو۔"

استثناء باب ۱۸ آیت ۱۸ میں کہا گیا۔

"اور خداوند نے مجھے کہا کہ انھوں نے جو کچھ کیا سو اچھا کیا۔ میں ان کے لیے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا۔"

یوحنا کی انجیل میں ہے۔

"جب وہ مددگار وکیل آئے گا جس کو میں تمہارے پاس باپ کی طرف سے بھیجوں گا یعنی سچائی کا روح جو باپ کی طرف سے نکلتا ہے تو وہ میری گواہی دے گا۔"

(باب پندرہ آیت ۲۶)

اور یہ حوالہ دیکھیے کتنے غیر مبہم انداز میں حضورؐ کی آمد کی بشارت دی گئی۔

"خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا۔ فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشیں شریعت ان کے لیے تھی (استثناء باب ۳۳، آیت ۲)

فصل ۱۰

حضورؐ امراضِ روح کے سب سے بڑے مُعالج تھے

ایک حکیم اور ڈاکٹر سے پوچھیے وہ آپ کو بتائے گا کہ ایک بچے، جوان اور سن رسیدہ معمر آدمی کا علاج کرنے میں ایک ہی نسخہ استعمال نہیں کیا جاتا۔ ایک بچے کے لیے دوا کی جو مقدار ہوتی ہے وہ ایک جوان یا معمر آدمی کے لیے کام نہیں دیتی اسی طرح علاج معالجہ کرتے وقت ایک مریض کی طبیعت اور ماحول کو بھی خاص طور پر پیشِ نظر رکھنا پڑتا ہے۔ ایک بلغمی مزاج کے آدمی کے لیے دوا اور اس کی مقدار کچھ اور ہے اور ایک صفراوی مزاج کے بیمار کے لیے کچھ اور ایک سرد علاقے کا رہنے والا شخص ایک گرم علاقے میں رہنے والے شخص سے مختلف نوعیت کے معالجاتی مطالبے رکھتا ہے، اور اگر ایک ڈاکٹر سے کہا جائے کہ وہ اس فرق کو ذہن میں رکھے بغیر امراضِ جسمانی کا علاج کرے تو وہ کبھی اس کے لیے تیار نہیں ہوگا۔

اب آپ اسی سے امراضِ روحانی اور ان کے معالجین کا طریقہ سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ اللہ تعالیٰ دنیا کے آغاز سے ہماری روحانی بیماریوں کو دور کرنے کے لیے اپنے پیغمبر بھیجتا رہا ہے لیکن

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ آدم اور نوح علیہ السلام کے زمانے کی شریعت آج بھی انسانیت کے روگوں کا شافی علاج ہے تو یہ اس کی کم فہمی اور ناسمجھی ہو گی۔ انسانیت کے بچپنے میں جو آسمانی شریعتیں نازل کی گئی تھیں وہ اس کے عہد شباب میں کام نہیں دے سکتیں۔ ہر دور کا مزاج اور بیماریاں جدا جدا ہیں اور اگر احوال و ظروف اور طبائع کے اختلاف کا لحاظ کیے بغیر ان کا علاج کیا جائے تو وہ کارگر ثابت نہیں ہو گا۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام اور دوسرے انبیاء کے عہد تک ذہن انسانی نے اتنی ترقی نہیں کی تھی۔ اس لیے جو شریعتیں ان کو دی گئیں وہ ہمارے دکھوں کا مداوا نہیں ہو سکتیں۔ ضرورت تھی کہ ان کے بعد زمانہ جو ارتقائی منازل طے کرنے والا ہے ان میں راہنمائی دینے کے لیے ایک کامل اور جامع شریعت نازل کی جائے جو رہتی دنیا تک انسان کی روحانی احتیاجات کی ضامن اور کفیل ہو۔ یہی شریعت خاتم الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے اور آپ کی بعثت کے بعد اللہ تعالیٰ نے پہلی تمام شریعتیں منسوخ کر دیں۔

اب اگر کوئی شخص حضرتِ عیسٰیؑ اور حضرتِ موسیٰؑ پر ایمان لاتا ہے۔ لیکن آنحضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار کرتا ہے تو اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے ہم ایک فن کے علماء کو تو مان لیں۔ لیکن اس کے امام اور ماہر خصوصی کی حیثیت تسلیم کرنے سے انکار کر دیں۔ حضرت امام ابن تیمیہؒ نے اپنی کتاب الجواب الصحیح میں اس کی بعض دلچسپ مثالیں دی ہیں فرماتے ہیں۔

"یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ زفر بن القاسم مزنی اور اثرم تو بڑے فقیہہ تھے لیکن ابو حنیفہؒ شافعیؒ اور مالکؒ فقیہہ نہیں تھے ـــ یا کہے کہ ملکی اور مسیحی وغیرہ طب کے مصنفین تو بیشک اطباء تھے مگر بقراط و جالینوس وغیرہ طبیب نہیں تھے یا کہے کہ کوشیا اور خلفی تو علمِ ہیئت سے واقف تھے لیکن بطلیموس وغیرہ کو ہیئت کا کوئی علم نہیں تھا۔ یا کوئی کہے کہ داؤدؑ دلیخا دھاتوس اور دانیال تو ضرور پیغمبر تھے لیکن محمد ابن عبد اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نبی نہیں تھے اس شخص کا تناقض اور اس کے قول کی نامعقولیت اوپر کے تمام اقوال سے زیادہ روشن ہے"[1]

---

[1] ترجمہ از مولانا ابوالحسن علی ندوی

فصل ۱۱

انسانیت کا سہارا

دنیا کے لوگ سہاروں کے بڑے قائل ہیں انھیں دولت و ثروت، اعزّا و اقربا اور اسباب و وسائل کے سہارے حاصل نہ ہوں تو یہ ہمت ہار بیٹھتے ہیں۔ قدم قدم پر انھیں ان چھوٹے سہاروں کی ضرورت رہتی ہے اور دیکھا جائے تو اس عالم اسباب میں اس کے بغیر کوئی چارہ ہے بھی نہیں ــــ اور زندگی کا سفر طے کرنے کے لیے آدمی ان بیساکھیوں سے کلیتہً بے نیاز ہو بھی نہیں سکتا۔

مگر تاریخ کی حد تک ایک استثناء اور حیرت انگیز استثناء وہ ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں پایا جاتا ہے۔ دنیا میں جتنے سہارے شمار کیے جا سکتے ہیں حضورؐ کو ان سب سے محروم رکھا گیا مگر دنیا نے سر کی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ وہی بے سہارا جو اس کے نزدیک یتیمِ عرب کی حیثیت رکھتا تھا، ایک وقت آیا کہ بھولی بھٹکی انسانیت کا سب سے بڑا سہارا بن گیا۔

والد کی شفقت اور محبت، کو ترقی کا زینۂ اول سمجھا جاتا ہے وہ آپ کو میسّر ہی نہیں ہوئی، والدہ کی شکل میں اس کمی کے پورا ہونے کا امکان تھا مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد

والدہ کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔ دادا نے چاہا کہ وہ آپ کو سینہ سے لگائے اور پیار سے رکھے مگر دستِ غیب محمدؐ کے معاملے میں دنیا کے کسی سہارے کی شراکت برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھا وہ بھی خدا کو پیارے ہوئے اور اب یہ بچہ نہ ماں باپ رکھتا تھا نہ شفیق و خلیق دادا کی سرپرستی اسے حاصل تھی۔ مہربان چچا آگے بڑھے اور کوئی شک نہیں کہ انھوں نے دل جوئی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں رکھا۔ لیکن تاریخ سے پوچھو تاریخ بتائے گی کہ اس کا —— جسے آدمیت کا سہارا بننا تھا سہارا وہ بھی نہیں بن سکے تاریخ گواہ ہے کہ آپ بکریوں اور اونٹوں کو چرا کر جو معاوضہ پاتے تھے اس سے ابوطالب کا گزارہ چلتا تھا اور آپ کے چچا کی یہ حالت تو تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ انھوں نے معاشی پریشانیوں کی وجہ سے اپنے ایک لختِ جگر جعفر طیار کو اپنے بھائی حضرت عباس کے حوالے کر دیا تھا۔ اس حالت کے ہوتے ہوئے کون کہہ سکتا ہے کہ وہ حضورؐ کا سہارا بن سکتے تھے بلکہ بنظرِ انصاف دیکھا جائے تو یہ ضرور ہے کہ آپ چچا کی معاشی زندگی کا سہارا بن گئے۔

دنیا والے علم و فضل کے لیے مکتب و مدرسہ کی سند کے محتاج ہیں وہ کسی عالم اور فاضل کے آگے زانوئے تلمذ تہ کرتے ہیں تب کہیں آدابِ زندگی سیکھنے کے قابل ہوتے ہیں۔ مگر یہاں معاملہ ہی دوسرا تھا۔ آپ کی تعلیم و تربیت براہِ راست خالقِ اکبر کے ذمے تھی اور اس نے دکھا دیا کہ محمدؐ نے اس پہلو میں بھی کسی معلّم اور کسی مکتب کو سہارا نہیں بنایا ہم دولت کی پوجا کرتے ہیں اور اس کے لیے کیا کیا پاپڑ نہیں بیلتے۔ روپیہ ہمارے نزدیک کامیابی کی کلید ہے یہ نہ ملے تو ترقّی کا دروازہ ہمارے لیے مقفّل رہتا ہے اور مل جائے تو پھر ہم اسے ٹھاٹھ باٹھ جمانے اور رعب گانٹھنے کا ذریعہ بناتے ہیں مگر تم دیکھو گے کہ محمدؐ کو حضرتِ خدیجہ سے نکاح کے بعد ہی دولت ملی مگر انھوں نے اسے جاہ و منزلت کے حصول کے لیے سہارا بنانے کی بجائے غریبوں اور

بیواؤں اور یتیموں میں لٹا دیا۔

ہم قوم اور وطن کو فرد کی کامیابی اور کامرانی میں بڑا دخیل مانتے ہیں خاکِ وطن کا ہر ذرّہ ہمارے لیے دیوتا کا مقام رکھتا ہے۔ مگر یہاں دیکھو گے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس قوم میں پیدا ہوئے وہ قوم کی حیثیت سے اپنا کوئی وجود ہی نہیں رکھتی تھی، وہ قبیلوں میں اور گروہوں میں بٹی ہوئی ایک بھیڑ تھی جس کے تصورات پست تھے اور عادات قبیح و شنیع تھیں۔ اور وطن ایک ایسی سرزمین تھی جو وادیٔ غیر ذی زرع کہلاتی تھی۔ جس میں لُو کے جھکّڑ چلتے تھے اور جو ٹیلوں اور پتھروں کے علاوہ اپنے دامن میں کچھ رکھتی ہی نہیں تھی ۔۔۔ ان حالات میں کون کہہ سکتا ہے کہ آپ کو جو محیّر العقول کامیابی حاصل ہوئی۔ اس میں قوم اور وطن کی موزونیت کا بھی کچھ ہاتھ ہوگا؟

یوں آپ غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ دنیا میں جتنے سہارے اور آسرے گنے جاتے ہیں، ان میں سے ایک سہارا بھی حضورؐ کو حاصل نہیں تھا۔ مگر اس کے باوجود آپ کو جو کامیابی نصیب ہوئی، آپ جو تعلیمات لے کر آئے جس علم و فضل کا مظاہرہ کیا دنیا اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ سوچیے!

کیا یہی ایک دلیل آپ کی صداقت کا اعتراف کرانے کے لیے کافی نہیں ہے۔

فصل ۱۲

سب سے بڑا معجزہ

دنیا میں جتنے انبیائے کرام تشریف لائے ہیں ان سب کو منکرینِ نبوت کی آنکھیں کھولنے کے لیے مختلف معجزات عطا ہوئے مگر آج وہ واقعہ کی حیثیت سے ہمارے سامنے موجود نہیں ہیں۔ ان کا علم ہمیں کتبِ آسمانی یا تاریخ سے ہوتا ہے مگر حضور نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض معجزات ایسے ہیں جو آج تک موجود ہیں اور یقیناً رہتی دنیا تک موجود رہیں گے۔ منکرینِ حق چاہیں تو آج بھی انھیں دیکھ کر رسالتِ محمدی کا ثبوت حاصل کر سکتے ہیں۔

سب کو معلوم ہے کہ حضورؐ اُمّی تھے۔ آپ نے کسی سے ایک لفظ تک نہیں سیکھا، شعروادب کی مجلسوں تک سے دُور رہے کسی مدرسہ میں آپ نے داخلہ نہیں لیا۔ نبوت سے قبل کی زندگی بھی اس پاک بازی سے گزاری کہ دوست دشمن آپ کی صداقت اور دیانت کے معترف تھے ایسے میں اچانک چالیس سال کے بعد دنیا نے آپ کی زبانِ مبارک سے وہ کلامِ الٰہی سنا جس کی فصاحت و بلاغت اور تعلیم و حکمت اپنی

نظیر آپ ہے۔ ایک ایسی کتاب جو علومِ اولین و آخرین کی جامع ہے جس میں انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر پہلو کے بارے میں بہترین ہدایات ہیں اور جس میں فرد سے لے کر ریاست تک کے لیے ایک بہترین نظامِ حیات ہے۔ ایک اُمّی کیسے پیش کر سکتا تھا شبہ کرنے والوں نے شبہ کیا کہ شاید یہ بھی کوئی انسانی تصنیف ہے مگر خود قرآن نے چیلنج دیا۔

وَاِنْ كُنْتُمْ فِىْ رَيْبٍ مِّمَّا	"اگر تم کچھ خلجان میں ہو اس کتاب کی
نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا	نسبت جو ہم نے نازل فرمائی ہے اپنے
بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا	بندۂ خاص پہ تو اچھا تو تم بنا لاؤ ایک
شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ	محدود ٹکڑا جو اس کا ہم پلہ ہو اور بلا
كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ فَاِنْ لَّمْ	لو اپنے حمائیتوں کو خدا سے جو الگ ہیں
تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا	اگر تم سچے ہو۔ اور اگر تم ایسا نہ کر سکو اور
النَّارَ الَّتِىْ وَقُوْدُهَا	یقیناً نہ کر سکو گے تو پھر ذرا بچتے ڈرتے
النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖ اُعِدَّتْ	رہو دوزخ سے جس کا ایندھن آدمی اور
لِلْكٰفِرِيْنَ ۝ (بقرہ)	پتھر ہیں۔"

اس چیلنج کے مخاطب، اول وہ لوگ تھے جن کی فصاحت اور بلاغت کا دنیا لوہا مانتی تھی۔ جنھیں اپنی زبان دانی کا اتنا غرّہ تھا کہ وہ اپنے سوا دوسروں کو عجم یعنی "گونگا" کہتے تھے ـــ یہ لوگ اسلام اور پیغمبرِ اسلام کی دشمنی میں خون کے دریا عبور کرنے کے لیے تیار تھے مال و دولت خرچ کر رہے تھے اور قرآن کے اس چیلنج کے بعد ان کے لیے یہ ایک سنہری موقع تھا کہ وہ آپ کو شکست دے سکیں۔ مگر ان کی زبانوں پر مہر لگ گئی اور بار بار کے چیلنج کے باوجود وہ اس کی نظیر پیش نہ کر سکے۔

فصاحت و بلاغت ہی نہیں علم و حکمت کے اعتبار سے بھی قرآن نے یہ چیلنج دیا مگر عہدِ نبوی پر موقوف نہیں آج چودہ صدیاں گزر جانے کے باوجود بھی دنیا اس کا

جواب پیش کرنے سے قاصر ہے۔ مستشرقین ہی کو لے لیجیے۔ انھوں نے اسلام دشمنی میں آگر کیا کچھ نہیں کیا۔ اتہامات لگائے، مغالطے پیدا کرنے کی کوشش کی مگر قرآن کے اعجازِ بیان اور حسنِ معنی کے آگے وہ بھی سر جھکانے پر مجبور ہو گئے۔ حال ہی میں انگلستان سے ایک کتاب شائع ہوئی ہے (WHAT HAPPENED IN HISTORY) اس کتاب میں جہاں دوسرے مذاہب اور عقائد پر بحث کی گئی ہے وہاں اسلام کا بھی ذکر آیا ہے۔ قرآن کے متعلق مضمون کی ابتدا ہی میں مصنف لکھتا ہے۔

"قرآن کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات ماننی پڑے گی کہ اس کا مصنّف خواہ کوئی ہو اپنے زمانہ ہی کا نہیں بلکہ بہت سے زمانوں کا ایک زبردست معلّم ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ قرآن کا مصنّف ایک برہانی اور عقلی دماغ کا "انسان" ہے۔ وہ اپنے ہر مضمون میں اس بات کی بڑی احتیاط کرتا ہے کہ دعوے بلا دلیل نہ ہو —— اس کا اندازِ فکر اس حکیم سے ملتا ہے جو صرف کائنات پر غور کرتا ہے اور اس سے نتائج اخذ کرتا ہے قرآن کی یہ خوبی پہلے تو انسان کو حیرت میں ڈالتی ہے، پھر اسے اپنی طرف کھینچتی ہے اور آخر میں اپنا گرویدہ بنا لیتی ہے۔"

دنیا میں متعدد کتابوں نے اپنے قارئین سے خراجِ تحسین وصول کیا ہے۔ ان کی تحریریں انسانی مزاج اور عادات و اطوار پر اثر انداز بھی ہوئی ہیں لیکن قرآن نے انسانی زندگی میں جو حیرت انگیز انقلاب پیدا کیا ہے، اس کی مثال ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ یہی وہ کتاب ہے جس نے اونٹ چرانے والوں کو انسانوں کا گلہ بان اور جہالت میں ڈوبے ہوئے بدّوؤں کو دنیا بھر کے لیے معلّمِ اخلاق بنا دیا اس نے ایک طرف خالدؓ، طارق اور محمد ابنِ قاسم جیسے سپہ سالار پیدا کیے تو دوسری طرف علیؓ، عائشہؓ، ابنِ مسعودؓ اور ابنِ عباسؓ جیسے علماء و فضلاء، ابوبکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ اور عمر ابن عبدالعزیزؒ جیسے حکمران بھی اسی کے سرچشمہ فیض سے سیراب ہوئے اور حضرت ابوذر اور حضرت ابوہریرہ جیسے درویش بھی اسی کے

جمالِ جہاں آرا سے مستنیر۔ سورج اور چاند کی روشنی تو زیادہ سے زیادہ ظاہری اندھیروں کو ختم کرتی ہے مگر قرآن وہ نور ہے جس نے دلوں کی ظلمتیں بھی دور کر دیں اور انسانوں کے ظاہر ہی نہیں باطن بھی منور کر دیے۔

دنیا کی دوسری قومیں بھی اپنے "صحائف" اور متبرک کتابوں کو مقدس مانتی ہیں مگر قرآن نے انسانی قلوب پر اپنی تقدیس و عظمت کا جو نقش قائم کیا ہے اسے خنجر و شمشیر سے بھی نہیں کھرچا جا سکتا۔ دنیا والے کئی کتابوں کے بارے میں دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ متبرک و مقدس ہیں، حق تعالیٰ کی نازل کردہ ہیں لیکن آج کتنے لوگ ایسے ہوں گے جن کے حافظے میں یہ کتابیں محفوظ ہیں، اول تو یہ کتابیں حفظ ہوتے ہی یاد نہیں آتیں اور اگر کوئی من چلا اس ناممکن کو ممکن بنا بھی دے تو چند دنوں کے بعد یہ آپ سے آپ حافظے سے نکل جاتی ہیں۔ مگر قرآنِ حکیم وہ زندہ کتاب ہے جو اس دورِ زوال میں بھی لاکھوں سینوں میں محفوظ ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں سے لے کر بڑے بوڑھوں تک کی نوکِ زبان ہے یہاں تک کہ اگر خدانخواستہ اس کے سارے نسخے ناپید کر دیے جائیں تب بھی ان عاشقانِ قرآن کے سینوں سے اس امانت کو زیر زبر پیش کے ساتھ پھر سے سینوں میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔ یوں ماننے کو ماننے والوں نے بہت سی کتابوں کو مانا ہے مگر کون سی وہ کتاب ہے جس نے اپنے ماننے والوں کو اس حد تک مسخر کیا ہو کہ وہ اس کے لکھنے کا معاوضہ بھی قبول کرنے سے احتراز کرتے ہوں، اورنگ زیب عالمگیر کا ایک وصیت نامہ بزبانِ فارسی اورنگ آباد دکن میں آج تک محفوظ ہے جس میں انھوں نے بتلایا کہ میرے ترکہ میں نقد روپیہ کی تفصیل یہ ہے۔ فلاں بی بی کے پاس اتنے درہم ہیں جو میں نے رومال اور ٹوپیوں کی کشیدہ کاری کر کے کمائے ہیں۔ فلاں کے پاس اتنے درہم ہیں جو قرآن مجید کی کتابت کی مزدوری سے حاصل کیے ہیں۔ یہ رقم اگرچہ کچھ زیادہ ہے لیکن میرا دل نہیں چاہتا کہ اللہ کی آیات لکھ کر فروخت کرنے سے جو رقم حاصل ہوئی اس سے مجھ پر کفن ڈالا جائے اگرچہ حقیقتاً یہ

آیاتِ الٰہیہ کی بیع ممنوع میں داخل نہیں۔ مگر صورت میں اس کے مشابہ ہے اس لیے اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضری کے وقت اس قسم کا کفن ہونے سے مجھے شرم آتی ہے۔ اس لیے دوسری رقم جو رومال اور ٹوپیوں کی مزدوری سے حاصل شدہ ہے وہ اگرچہ کم ہے مگر اس سے معمولی قسم کا کپڑا خرید کر میرا کفن بنا دیا جائے۔

اس درویش بادشاہ کی یہ وصیت اصل میں اس تعلیمِ قرآنی پر عمل کرنے کا ایک محتاط ترین نمونہ بھی جس میں کہا گیا ہے کہ خدا کی آیات کو ثمنِ قلیل کے عوض فروخت نہ کرو، رضائے خداوندی تو اس کا بدل بن سکتی ہے دنیا کی کوئی دوسری چیز اس کا بدل نہیں بن سکتی۔

دنیا میں جن کتابوں کے الہامی ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے ان سب میں اصل متن کی حفاظت کے لحاظ سے بھی قرآنِ حکیم ایک ما بہ الامتیاز حیثیت کا حامل ہے۔ اول تو قرآنِ حکیم کے سوا دنیا کی کوئی کتاب یہ دعویٰ ہی نہیں کرتی کہ اس کے الفاظ بھی اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ ہیں۔ کتابِ مقدس تک کے بارے میں اس کے ماننے والوں کا دعویٰ صرف اتنا ہے کہ اپنے مفہوم و معنی کے اعتبار سے یہ خدا کا کلام ہے مگر قرآنِ حکیم نہ صرف اپنے ایک ایک لفظ کو کلامِ الٰہی کہتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی اس ذمہ داری کا بھی اعلان کرتا ہے کہ اے پیغمبر تجھ پر جو "ذکر" نازل کیا جا رہا ہے اس کی حفاظت ہم خود کریں گے۔ یہ اہتمام کسی کلام کو نصیب نہ ہو سکا کہ اسے لفظ بہ لفظ لاکھوں کروڑوں سینوں میں محفوظ کر لیا جائے۔ یہ خصوصیت فقط قرآن کو حاصل ہے کہ یہ عہدِ نبوی سے لے کر اس عہدِ زوال تک ہر دور میں لاکھوں انسانوں کے نوکِ زبان رہا ہے۔

پھر خاتم الانبیاء حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عظیم الشان معجزہ کا ایک پہلو اور بھی ہے ـــ سب کو معلوم ہے کہ مکہ سے ہجرت کرنے کے بعد مدینہ منورہ میں آنحضورؐ کو آزادی کے صرف دس سال گزارنے کا موقع ملا۔ ان دس سالوں میں بھی تاریخ اٹھا کر دیکھیں تو چھ سال جہاد و قتال میں صرف ہو گئے اور یہود اور کفار و منافقین کے ساتھ بیشتر

معرکے اسی زمانے میں پیش آئے۔ اس حساب سے مدینہ میں آنحضورؐ کو قرآن کی بنیادوں پر ایک نظامِ حکومت قائم کرنے کے لیے صرف چار سال کی مہلت ملی مگر اس مختصر سے عرصہ میں جو نظام قائم ہوا اپنے تو اپنے غیر بھی اس کے معترف ہیں کہ اس آسمان کے نیچے وہ ایک لاجواب اور بے مثال نظام تھا۔ حکومتوں کی عملداری صرف جسموں پر قائم ہوتی ہے مگر قرآن کی بنیاد پر جو حکومت قائم ہوئی تھی روحوں کی دنیا میں بھی اس کا قانون نافذ ہوا۔ دن کے اجالے میں اور رات کی تاریکی میں کھلے اور چھپے ہر مقام اور ہر وقت میں اس حکومت کی رعایا نے شریعت کا احترام کیا اور تنہائی میں قانون کی خلاف ورزی کرنے والے حاکمِ وقت کے پاس خود چل کر آئے کہ انھیں سزا دی جائے۔

پھر —— قرآن نے نظامِ حکومت چلانے کے لیے جو رہنمائی دی ہے وہ کسی خاص وقت اور مقام تک محدود نہیں۔ آج بھی اس سے فائدہ اٹھایا جائے تو انسانی زندگی تمام فتنوں اور مصیبتوں سے پاک اور صاف ہو جائے (WHAT HAPPENED IN HISTORY) کا مصنف لکھتا ہے۔

> "میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ یورپ کے معاہدے، یورپ کی دفاعی تدابیر، یورپ کا سیاسی اتحاد اور بین الاقوامی پارلیمنٹ یا حکومت کی تجویز اور دوسری تمام تدابیر ناکام و بے سود رہیں گی اگر اس کی بنیادوں میں خدا کے تصور اور اخلاقی قدروں کو جگہ نہ دی گئی جہاں عالمی امن کے لیے بہت سے نسخے آزمائے ہیں وہاں مذہب کا یہ نسخہ بھی آزما کر دیکھ لینا چاہیے۔ اگر اس کے لیے کوئی تیار ہو تو میں مشورہ دوں گا کہ وہ اس سلسلہ میں قرآن کو ہرگز نظر انداز نہ کرے کیونکہ اس راہ کی رہنمائی اس کتاب سے بہتر کوئی اور کتاب انجام نہیں دے سکتی"

اعجازِ قرآنی کا یہی وہ پہلو تھا جسے دیکھ کر انگلستان کا مشہور مورخ گبن بے اختیار پکار اٹھا۔

"قرآن کی نسبت بحر اطلانٹک سے لے کر دریائے گنگا تک نے مان لیا ہے
کہ یہ پارلیمنٹ کی روح ہے ۔ قانون کی اساس ہے اور صرف اصولِ مذہب ہی
کے لیے نہیں بلکہ احکامِ تعزیرات کے لیے اور قوانین کے لیے بھی ہے ۔۔۔
حقیقت یہ ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شریعت سب پر حاوی ہے
یہ شریعت ایسے دانش مندانہ اصول اور اس قسم کے قانونی انداز پر مرتب ہوتی
ہے کہ سارے جہان میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی"[1]

[1] سلطنت روما کا انحطاط و زوال جلد ۵ باب ۵ بحوالہ شہادت الاقوام صفحہ ۱۵

فصل ۱۳

حضورؐ

کا

اُسوۂ

حسنہ

تاریخ میں آج تک ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا جس سے یہ ثابت ہو کہ مجرّد کسی کتاب نے دنیا میں انقلاب برپا کیا۔ انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ اس وقت تک کسی اصول سے صحیح معنوں میں متاثّر نہیں ہوتا جب تک اس کا کوئی عملی نمونہ اس کے سامنے نہ آجائے۔ قرآن آج بھی موجود ہے لیکن مسلمانوں کی زندگی میں صحابہؓ کرام کے کردار کی جھلک تک نہیں پائی جاتی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ قرآن میں اب وہ انقلاب انگیز اثرات و خصوصیات باقی نہیں رہیں۔ نہیں وہ جوں کی توں موجود ہیں اور ابد تک موجود رہیں گی۔ مگر فرق صرف یہ واقع ہو گیا ہے کہ ہمیں اس معلّم اور مزکّی کی معیّت اور صحبت حاصل نہیں جس کی حیاتِ پاک کا ایک ایک لمحہ قرآن کی زندہ تشریح و تفسیر تھا۔ خود قرآن نے کہا۔

هُوَ الَّذِىْ بَعَثَ فِى الْاُمِّيّٖنَ	وہی ہے جس نے ان پڑھوں میں ایک
رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ	رسول انھیں میں سے مبعوث فرمایا جو ان

اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ ق وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ o (الجمعہ ۱)

پر اس کی آیتیں پڑھتا ہے اور انھیں پاک کرتا ہے اور انھیں کتاب و حکمت سکھاتا ہے اور بے شک اس سے پہلے وہ صریح گمراہی میں تھے۔

اب اگر اس کمی کو پورا کیا جا سکتا ہے تو صرف اس طرح کہ حضور نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور ارشادات کو دلیلِ راہ بنایا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی لیے فرمایا۔
"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ زندگی میں تمھارے لیے بہترین نمونۂ عمل ہے۔ (الاحزاب)

دنیا میں بہت سے لوگوں نے وعظ کہے ہیں اور بڑے اچھے انداز میں کہے ہیں، اصول پیش کیے ہیں اور سنہری اصول پیش کیے ہیں مگر بہت کم ایسے ہیں جنھوں نے ان پر عمل کر کے دوسروں کے لیے آسانیاں پیدا کی ہوں، یہ شان آپ کو اس معلّمِ انسانیت کی زندگی میں نظر آئے گی کہ جو بات فرمائی سب سے پہلے خود اس پر عمل کیا۔ آپ نے یہ تعلیم دی کہ پانچ وقت کی نماز پڑھنی چاہیے۔ مگر آپ خود صرف پانچ وقت کی نہیں آٹھ وقت کی نماز ادا فرماتے تھے۔ چاشت، اشراق اور تہجد کے نوافل پانچ نمازوں کے علاوہ تھے۔ اور نمازیں بھی کیسی نمازیں کہ صحابہؓ کہتے ہیں۔ نماز پڑھنے وقت ہم آپ کے سینہ کی آواز اس طرح سنتے تھے جیسے ہانڈی میں اُبال آتا ہے۔ نمازوں میں رونے کی وجہ سے آپ کے سینۂ مبارک میں چکّی چلنے کی آواز آتی۔ رات رات بھر خدا کے حضور مصلّیٰ پر کھڑے رہتے یہاں تک کہ پاؤں سوج جاتے۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ عرض کرتیں یا رسول اللہ! آپ تو معصوم ہیں آپ کو اس عبادت و ریاضت کی کیا ضرورت ہے اور حضورؐ فرماتے۔ اَفَلَا اَکُوْنَ عَبْدًا شَکُوْرًا۔ کیا میں خدا کا شکر گزار بندہ نہ بنوں۔

آپ نے یہ ہدایت کی کہ سال بھر میں ایک ماہ کے روزے رکھنے چاہئیں مگر خود

اپنا عمل یہ تھا کہ سال میں کوئی مہینہ بلکہ کوئی ہفتہ ایسا نہیں گزرتا تھا جس میں حضورؐ روزے سے نہ ہوں۔ اور روزے بھی ایسے روزے کہ ایک دن نہیں مسلسل دو دو تین تین دن بن کھائے پیئے گزر جاتے۔ صحابہؓ عرض کرتے یا رسول اللہ کیا اس سلسلے میں ہم بھی آپ کی پیروی کریں اور حضورؐ جواب دیتے۔ نہیں تم اس معاملے میں میری پیروی نہیں کر سکتے۔ مجھے تو میرا آقا و مولا کھلا پلا دیتا ہے۔

زہد و قناعت کی تلقین فرمائی تو یہ نمونہ پیش فرمایا کہ سلطانِ عرب ہونے کے باوجود چٹائی پر سوتے اور اٹھتے تو آپ کے جسم مبارک پر چٹائی کے نشانات پڑ جاتے۔ صحابہؓ عرض کرتے یا رسول اللہ اجازت ہو تو ہم آپ کے لیے ایک بچھونا تیار کر لیں تو آپ فرماتے مجھے دنیا سے کیا کام۔ میری مثال تو اس مسافر کی ہے جو تھوڑی سی دیر کے لیے درخت کے سائے تلے آرام کرے اور پھر اس کو چھوڑ کر چل دے — دنیا نے فقر اور درویشی کے کئی مناظر دیکھے ہوں گے مگر یہ کم دیکھا ہوگا کہ سرورِ کائنات کی لختِ جگر آئے۔ باپ کی خدمت میں حاضر ہو کر ہاتھ کے چھالے دکھائے۔ کہے اباجی، دیکھیے چکی پیستے پیستے میرے ہاتھوں پر چھالے پڑ گئے ہیں۔ مشکیں ڈھوتے ڈھوتے جسم پر داغ پڑ گئے ہیں۔ اباجی، مجھے بھی خادمائیں عطا ہوں اور حضورؐ ارشاد فرمائیں فاطمہؓ! یہ خادمائیں تمہیں نہیں مل سکتیں۔ یہ تو مدینے کی بیواؤں اور محتاجوں کے لیے ہیں — دنیا کی کس "شہزادی" نے یہ نظیر پیش کی ہو گی؟

آسیا گرداں و لب قرآں سرا

کون ہے جس کو مال و دولت اور سیم و زر کی پیشکش کی گئی ہو اور وہ اس پر زہد کی زندگی کو ترجیح دے۔ حضورؐ فرماتے ہیں حق تعالٰی نے مکہ مکرمہ کے اس پتھریلے میدان کو سامنے کر کے مجھ کو یہ اختیار دیا تھا کہ اگر میں پسند کروں تو وہ اپنی قدرت سے اس کو سونا بنا دے میں نے عرض کی۔

پروردگار! میں تو یہ چاہتا ہوں کہ ایک دن شکم سیر رہوں تو ایک دن بھوکا بھی رہوں۔ جب بھوکا ہوں تو تیرے سامنے گریہ و زاری کروں اور تیری یاد کروں اور جب شکم سیر ہوں تو تیری حمد و ثنا کروں اور تیرا شکر بجا لاؤں (احمد و ترمذی)

حضورؐ نے اگر طالبِ علم کی نصیحت فرمائی اور یہ کہہ کر فرمائی کہ اس کے لیے چین بھی جانا پڑے تو بھی گریز نہ کرو۔ تو علم کے لیے ذوق و شوق کی یہ عملی مثال بھی دنیا کے سامنے پیش کی کہ ابتدا میں جب کبھی وحیِ الٰہی کا سلسلہ کچھ مدت کے لیے رک جاتا۔ آپ سخت بے چین ہو جاتے اور ایسا لگتا جیسے آپ زندگی سے بیزار ہیں۔ خود قرآن نے شہادت دی۔

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ
لِتَعْجَلَ بِهٖ ۝ اِنَّ عَلَيْنَا
جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝ فَاِذَا
قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۝
ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ۝
(قیامہ)

قرآن کے ساتھ اپنی زبان کو اس لیے حرکت نہ
دیجیے کہ آپ اسے جلد اخذ کریں، یقیناً اس
کا جمع کرنا اور پڑھانا ہمارے ذمہ ہے تو
جب ہم اسے پڑھیں تو آپ اس پڑھنے کی
پیروی کریں۔ پھر ہمارے ہی ذمے اس کی
تشریح بھی ہے۔

دنیا نے زبانِ مبارک سے قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ ثُمَّ اسْتَقِمْ کے الفاظ سنے تو یہ کردار بھی دیکھا کہ پتھر کھائے جا رہے ہیں طعنے سہے جا رہے ہیں نظر بندی کی تکلیفیں برداشت کی جا رہی ہیں، چوٹی سے ایڑی تک خون بہہ رہا ہے مگر ایسے میں بھی استقامت و عزیمت میں فرق نہیں آتا، حضرتِ حق سے کوئی شکوہ و شکایت نہیں، التجا ہوتی ہے تو صرف یہ اَللّٰهُمَّ اهْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ اے پروردگار! میری قوم کو ہدایت دے کہ یہ لوگ نہیں جانتے۔

فصل ۱۴

حضورؐ کی امتیازی حیثیت

ہم جس دنیا میں بس رہے ہیں یہ مختلف النّوع طبقاتِ انسانی پر مشتمل ہے اس میں وہ لوگ بھی ہیں جن میں علم و فضل کا شہرہ ہے اور وہ بھی ہیں جو اپنی استعداد کے لحاظ سے بالکل جاہل اور بے علم ہیں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو ہر بات کو دلیل کی کسوٹی پر جانچتے اور پرکھتے ہیں اور ایسے افراد بھی بہت تعداد میں ہیں جن کی طبیعتیں خرقِ عادت افعال دیکھے بغیر مطمئن نہیں ہوتیں، یہاں بادشاہ بھی رہتے ہیں اور گدا بھی اور دیکھا جائے تو یہی وہ تنوّع اور اختلاف ہے جس پر اس عالمِ رنگ و بو کی تمام تر رعنائیوں کا دار و مدار ہے، شاعر نے اگر کہا تو غلط نہیں کہا

گلہائے رنگا رنگ سے ہے زینتِ چمن
اے ذوق اس چمن کو ہے زیب اختلاف سے

دنیا کی اس رنگا رنگی کے پیشِ نظر عقل تقاضا کرتی ہے کہ جس شخصیت کو آدمیت کے لیے کامل نمونہ ہونے کا مقام حاصل ہو، وہ کسی ایک طبقہ اور گروہ ہی کے لیے اپنی زندگی

میں رہنمائی کا سامان نہ رکھتی ہو بلکہ اس کی آفتاب صفت سیرت کی ضو پاشیاں ہر کہ ومہ کے لیے عام ہوں، وہ پستیوں کو بھی اسی طرح جگمگا دے جس طرح بلندیوں کو، عالموں اور فاضلوں کے لیے بھی اس کے روشن کردار میں "برہانِ رسالت" ہو اور جاہلوں اور بدوؤں کے لیے بھی طمانیتِ قلب کا سامان، وہ صرف بڑے بوڑھوں ہی کو متاثر نہ کرے بلکہ اس کی پاک زندگی میں نوجوانوں کے لیے بھی ایک بہترین نمونہ عمل ہو وہ بادشاہ و گدا اور امیر و غریب کو یکساں مستفیض و مستفید فرمائے۔ آپ اگر اس نقطہ نظر سے حضور کی زندگی کا مطالعہ کریں گے تو بے اختیار پکار اٹھیں گے کہ،

بہارِ عالمِ حُسنش جہاں را تازہ می دارد
برنگ اصحابِ صورت را بُو اصحابِ معنی را

دنیا میں حضرتِ عیسیٰؑ اور حضرتِ موسیٰؑ سمیت جتنے بھی انبیاء تشریف لائے ہیں ان کی زندگی کے بہت کم حالات ہمارے سامنے ہیں بعض تو وہ ہیں جن کے ناموں کے سوا اور کچھ معلوم ہی نہیں مگر جن کے متعلق دنیا کچھ جاننے کا دعویٰ کر سکتی ہے ان کے متعلق بھی گنتی کے چند واقعات کے سوا باقی ماندہ تفصیلات ناپید ہیں۔ حضرتِ عیسیٰؑ اور حضرت موسیٰؑ دنیا کے دو عظیم مذاہب کے بانی سمجھے جاتے ہیں اور ان کے "پیروؤں" کی بڑی بھاری تعداد آج بھی روئے زمین پر موجود ہے مگر خود ان کی زندگی کے بہت کم اجزاء محفوظ رہ سکے ہیں اور سچ پوچھیے تو ان اجزا کو بھی محفوظ نہیں کہا جا سکتا۔ توراۃ جس سے حضرت موسیٰؑ کی زندگی کا سراغ ملتا ہے اس کے متعلق خود یہودی بتاتے ہیں کہ وہ کئی بار دنیا سے غائب کر دی گئی۔ اس کے تمام نسخوں کو متعدد مرتبہ جلایا گیا۔ یہاں تک کہ اب صرف اس کے ترجمے باقی ہیں۔ اصل کتاب بے نشان ہو کر رہ گئی ہے اور عجیب ستم ظریفی یہ ہے کہ اس توراۃ میں جسے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل شدہ کتاب مانا جاتا ہے حضرت موسیٰؑ کی تجہیز و تکفین کے قصے درج ہیں۔

انجیل جو حضرت عیسیٰؑ کی سیرت کا واحد ماخذ بن سکتی تھی۔ اس کی صحت کا حال کچھ

اس سے بھی خراب تر ہے۔ عیسائیوں کے ہاں سینکڑوں بلکہ ہزاروں انجیلیں پائی جاتی ہیں مگر آج ان میں سے صرف چار انجیلوں کو معتبر مانا جاتا ہے اور یہ چار انجیلیں بھی کیسے منتخب ہوئیں، یہ واقعہ بھی سننے سے تعلق رکھتا ہے۔ ۳۲۵ء میں قسطنطینِ اعظم نے مشرقی روم کے ایک شہر نیقیہ میں پادریوں کی ایک کانفرنس منعقد کی جس میں تین سو پادری اطراف واکناف سے شریک ہوئے۔ بادشاہ کی صدارت میں مسلسل دو مہینے تک کانفرنس کے اجلاس ہوتے رہے۔ اسی دوران ایک گرجا میں تمام انجیلیں ڈھیر کر دی گئیں اور پادری سجدے میں گر کر دعائیں مانگتے رہے کہ اے رب! جو انجیلیں جھوٹی ہیں وہ ضائع ہو جائیں۔ چنانچہ مشہور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دعا منظور کی اور چار انجیلوں کے سوا باقی تمام انجیلیں ضائع ہو گئیں۔ اس کے بعد سے یہی چار انجیلیں مستند و معتبر سمجھی جاتی ہیں۔

جن کتابوں کے "استناد" کا عالم یہ ہو اول تو ان پر اعتماد کیا ہی نہیں جا سکتا۔ لیکن بفرضِ محال انھیں موجودہ شکل میں سچا تسلیم کر بھی لیا جائے تب بھی ان سے ان جلیل القدر انبیاء کے احوال اور تذکرے مرتب نہیں ہو سکتے۔ تورات کی اطلاع کے مطابق حضرت موسیٰؑ کی عمر ایک سو بیس برس تھی۔ ان ایک سو بیس برسوں میں چند موٹے موٹے واقعات کے علاوہ ہمیں ایک خلا ہی خلا نظر آتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کی روز مرہ کی زندگی، جماعتی معاملات و تعلقات کہیں زیرِ بحث نہیں آتے۔ انجیلوں میں حضرت عیسیٰؑ کی عمر ۳۳ سال بیان کی گئی ہے مگر ان ۳۳ سالوں میں صرف آخری تین سالوں کے حالات انجیلوں سے معلوم کیے جا سکتے ہیں۔ بقیہ زندگی پر تاریکی کے "دبیز" پردے پڑے ہوئے ہیں مگر جب وہ آیا جس کے متعلق مسیح یہ کہہ کر دنیا سے تشریف لے گئے تھے کہ،

"میرا جانا ہی تمھارے لیے بہتر ہے کیونکہ آنے والا میرے جانے کے بغیر نہیں آئے گا۔"

تو اس کی زندگی کی جملہ تفصیلات کو نوعِ انسانی کی متاعِ عزیز کی حیثیت سے رہتی دنیا تک کے لیے ہر التباس اور ہر شک و شبہ سے محفوظ کر دیا گیا۔

وہ پاکباز انسان جنھوں نے گلشنِ انسانیت کے اس گلِ سرسبد کی بو باس کو سونگھا اور سونگھ کر ہم تک پہنچایا ایک لاکھ سے زیادہ شمار کیے گئے ہیں۔

تذکرۂ رسالت کے ایک ایک واقعہ کو عموماً آٹھ آٹھ دس دس راویوں نے بیان کیا ہے اور تاریخ کا یہ عظیم و جلیل تذکرہ اتنا مکمل اور اتنا جامع و مانع ہے کہ گو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے رخصت ہو گئے لیکن آج بھی آپ کی پاک زندگی کا گوشہ گوشہ ہمارے سامنے کھلی ہوئی کتاب کے مانند موجود ہے۔ یہاں کوئی سوال ایسا نہیں جس کا جواب نہ ملتا ہو۔ کوئی شبہ ایسا نہیں جو دور نہ ہوتا ہو۔ آپ چاہیں تو یہ تک معلوم کر سکتے ہیں کہ حضورؐ بالوں میں کنگھا کس طرح فرماتے تھے۔ حضورؐ سرمہ کس طرح ڈالتے تھے۔ حضورؐ کا جوتا کس طرح کا تھا اور حضورؐ کا پسینہ کیسا تھا یہ اور اس طرح کی تمام جزئیات آپ کو مرتّب شکل میں مل سکتی ہیں۔ جنابِ رسالت مآب کی یہ وہ امتیازی شان ہے جسے باسورتھ اسمتھ نے دیکھا تو یہ کہنے پر مجبور ہو گیا۔

"کوئی شخص یہاں (محمدؐ کی سیرت) کے متعلق نہ خود کو دھوکا دے سکتا ہے اور نہ دوسرے کو کہ یہاں دن کی پوری روشنی ہے۔[1]"

اور پھر انھیں تذکروں پر موقوف نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر خدانخواستہ یہ تذکرے بھی نہ ہوتے تب بھی تنہا قرآن سے آپ کی زندگی پر اتنی روشنی پڑ جاتی ہے کہ کوئی چاہے تو فقط اسی سے آپؐ کی سیرت مرتّب کر دے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ام المومنین حضرت عائشہؓ سے آپ کی سیرت کے متعلق استفسار کیا گیا تو انھوں نے جواب دیا۔ کَانَ خُلُقُہُ الْقُرْاٰنُ۔ آپ کے اخلاق کی تصویر۔ قرآن ہے۔ پھر دیکھنے والے دیکھیں اور سوچنے والے غور کریں تو انھیں نظر آئے گا کہ رسالتِ محمدی کی امتیازی حیثیت کچھ یہیں تک محدود نہیں ہے۔ آپ کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ آپ کی زندگی تمام انسانی جماعتوں اور گروہوں کے لیے مثالی

---

[1] لائف آف محمد ص ۱۰۸

زندگی ہے آپ بادشاہوں اور جرنیلوں اور ججوں کے لیے بھی نمونہ ہیں۔ شوہروں، باپوں اور بیٹوں کے لیے بھی نمونہ۔ تاجروں اور معلّموں اور زاہدوں کے لیے بھی آپ کی زندگی میں ہدایت ہے اور امیروں، غریبوں اور درویشوں کے لیے بھی اسوۂ کاملہ۔ انسان کسی پیشہ اور کسی استعداد کا ہو بشرطیکہ وہ انسان ہو حضورؐ کی پاک زندگی میں اس کے لیے کامل رہنمائی پائی جاتی ہے — اس کمالِ راہنمائی کا اثر دیکھنا ہو تو صحابہؓ کی زندگی میں دیکھیے۔ یہاں بہترین سپہ سالار اور جرنیل اور حکمران و مدبّر بھی آپ کو مل جائیں گے اور زاہد و عابد فقیر درویش متوکّل علی اللہ افراد بھی، یہاں آپ کو علماء و فضلا اور تجّار اور ہر طبقہ سے تعلق رکھنے والی بہترین انسانی ہستیاں نظر آجائیں گی — ان ہستیوں کو دیکھیے اور اس کے بعد فیصلہ کیجیے کہ۔

جب اس آفتاب کی کرنوں میں اتنی درخشندگی و تابندگی ہے تو پھر خود اس آفتاب کی نورانیت کا کیا عالم ہوگا۔!!

فصل

اطاعتِ رسولؐ

اس ظلمت کدۂ عالم میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جتنے انبیاء تشریف لائے ہیں ان کی حیثیت صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ انھوں نے ہم تک مالکِ کائنات کا حکم پہنچا دیا اور بس۔ بلکہ قرآن شہادت دیتا ہے کہ ان کی بعثت کا ایک اہم مقصد یہ بھی تھا کہ لوگ ان کی اطاعت کریں اور اس اطاعت کے ذریعے خدا کی رضا حاصل کریں۔ قرآن نے کہا۔ وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰہِ ہم نے جتنے بھی رسول بھیجے ہیں اس لیے بھیجے ہیں کہ ان کی اطاعت کی جائے اور یہ اللہ کے اذن سے ہے"۔ اسی مضمون کو ایک اور اسلوب سے یوں بیان فرمایا ہے۔

جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اس نے یقیناً اللہ کی اطاعت کی" (النساء ۸۰) اور اس اطاعت کی بھی تشریح فرما دی کہ یہ اطاعت ایسی ہو جس میں اخلاص و انقیاد اور تسلیم و رضا کی تمام خصوصیتیں موجود ہوں۔ یہاں تک تنبیہ کر دی کہ اگر اطاعتِ رسول میں ذرہ برابر بھی دل کی تنگی پائی گئی تو یہ ایمان کے فقدان کی علامت ہو گی۔ سورۂ نساء میں کہا گیا۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى	پس قسم ہے آپ کے رب کی یہ لوگ ہرگز
يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ	مومن نہ ہوں گے جب تک کہ ایسا نہ ہو کہ
بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا	وہ آپس کے تمام جھگڑوں میں آپ کو حکم
فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا	بنائیں پھر جو فیصلہ آپ فرما دیں اس سے
مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا	اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہ پائیں اور اپنے
تَسْلِيمًا ۝	آپ کو بالکل حوالہ کر دیں۔

پھر اس اطاعت کو صرف زندگی کے اہم معاملات تک ہی محدود نہیں رکھا گیا بلکہ یہ حکم دیا گیا کہ چھوٹے سے چھوٹے معاملہ میں بھی رسول کی اطاعت کی جائے۔ اجازت لے کر رخصت ہونا یا بلا اجازت چلے جانا یہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں ہے لیکن اگر کسی اجتماعی کام میں شرکت کرنے کے بعد رسولؐ کی اجازت لیے بغیر کوئی شخص رخصت ہو جائے تو یہی بات شرائطِ ایمان کی خلاف ورزی کا باعث بن جاتی ہے۔ قرآن نے بتایا۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللّٰهِ	مومن تو اصل میں وہی ہیں جو اللہ اور رسولؐ
وَرَسُولِهِ وَإِذَا كَانُوا مَعَهُ عَلٰى	کو دل سے مانیں اور جب کسی اجتماعی کام
أَمْرٍ جَامِعٍ لَمْ يَذْهَبُوا حَتّٰى	کے موقع پر رسولؐ کے ساتھ ہوں تو اس سے
يَسْتَأْذِنُوهُ ۚ إِنَّ الَّذِينَ	اجازت لیے بغیر نہ جائیں جو لوگ تم سے
يَسْتَأْذِنُونَكَ أُولٰئِكَ الَّذِينَ	اجازت مانگتے ہیں وہی اللہ اور رسولؐ
يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ ۚ	کے ماننے والے ہیں۔

جنت میں کون داخل ہوگا اور کون نہیں۔ حضورؐ نے خود اس کو واضح فرمایا اور بتا دیا کہ جو لوگ میری اطاعت کریں گے وہی جنت میں داخل ہوں گے۔ حضورؐ نے فرمایا۔

كُلُّ أُمَّتِي يَدْخُلُونَ	یعنی میری اُمت کے تمام افراد جنت میں
الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ أَبٰى قَالُوا	داخل ہوں گے بجز ان کے جو میرا انکار کریں گے

يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَنْ اَبٰى؟	پوچھا گیا۔ آپ کا انکار کرنے والے کون
قَالَ مَنْ اَطَاعَنِیْ دَخَلَ	ہیں؟ فرمایا جس نے میری اطاعت کی وہ جنت
الْجَنَّةَ وَمَنْ عَصَانِیْ فَقَدْ	میں ضرور داخل ہو گا اور جو میری نافرمانی
اَبٰى (بخاری)	کرے وہی میرا انکار کرنے والا ہے۔

اندازہ کیجیے یہی نہیں کہ اطاعت کرنے والوں کو جنت میں داخل ہونے کا مژدہ سنایا جا رہا ہے۔ بلکہ وہ لوگ جو آپ کو پیغمبر مان کر حلقۂ اطاعت سے باہر نکلے ہیں۔ ان کو منکر رسالت قرار دیا جا رہا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر کو ماننا اس طرح کا ماننا نہیں ہے جس طرح ہم کسی تاریخی شخصیت کو تسلیم کرتے ہیں یا محض کسی کی صداقت کا اقرار کرتے ہیں بلکہ یہ وہ ماننا ہے جس کے لیے اطاعت شرطِ اول کا حکم رکھتی ہے اور اسی وجہ سے قرآن نے اعلان کیا ہے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ	ان لوگوں سے یہ کہہ دیجیے کہ اگر تم واقعی
اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ	اللہ سے محبت رکھتے ہو تو تم کو میری
اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ط	پیروی کرنی چاہیے۔ اللہ تم سے محبت
وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝	فرمانے لگے گا اور تمہاری خطاؤں سے
(آلِ عمران)	درگزر فرمائے گا۔

عبادت کتنا پسندیدہ فعل ہے؟ یہاں تک کہ اسے جن و انس کی پیدائش کا مقصدِ اولین بتایا گیا ہے مگر یہی عبادت جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے سے ہٹ کر کی جاتی ہے تو ناپسندیدہ قرار پاتی ہے۔ مشہور واقعہ ہے کہ ایک دفعہ تین صحابیؓ ام المومنین کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کی عبادت کا حال پوچھا۔ جب تفصیل بیان کی گئی تو وہ اسے اپنے حق میں کچھ کم سمجھے اور کہنے لگے کہ آپؐ تو معصوم ہیں پھر آپ کا اور ہمارا کیا مقابلہ؟ ان میں سے ایک نے کہا میں تو ہمیشہ تمام رات نماز پڑھوں گا۔ دوسرے نے

کہا میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا تیسرے نے کہا میں کبھی نکاح نہیں کروں۔ ابھی یہ گفتگو جاری تھی کہ اس اثنا میں آنحضورؐ تشریف لے آئے۔ آپ نے فرمایا تم لوگ ایسی ایسی باتیں کر رہے تھے تو سن لو! تم سب میں اللہ تعالیٰ سے زیادہ ڈرنے والا میں ہوں اور تم سب سے بڑھ کر متقی بھی ہوں میں تو روزہ بھی رکھوں گا اور افطار بھی کروں گا۔ شب میں نماز بھی پڑھوں گا اور سوؤں گا بھی اور عورتوں سے نکاح بھی کروں گا۔

اب جو شخص میرے طریقہ سے اعراض کرے گا وہ مجھ سے نہ ہوگا (متفق علیہ)

اندازہ کیجیے شریعت میں اطاعتِ رسولؐ کا مقام کتنا اعلیٰ وارفع ہے؟ یہاں صرف شوقِ عبادت کا اظہار کیا جا رہا ہے اور محبتِ الٰہی سے سرشار ہو کر فقر و درویشی کے عہد کیے جا رہے ہیں لیکن فقط اس لیے ان کے نماز روزہ اور مراسم بندگی کو نامناسب قرار دیا جاتا ہے کہ وہ اسوۂ رسولؐ کے مطابق نہیں ہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اصل عبادت آپؐ ہی کی اطاعت اور آپؐ ہی کی اتّباع ہے جو شخص اس معاملے میں جتنا آگے ہوگا اُتنا ہی زاہد و عابد اور خدا کا محبوب و مقرب ہوگا۔ بات صاف نہ ہوئی ہو تو ایک اور واقعہ پیش کرتا ہوں اس سے بندگی اور عبادت کی اصلیت سامنے آجائے گی۔ واقعہ یہ ہے (حضرت جابرؓ اس کے راوی ہیں) کہ ایک بار حضور نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان المبارک میں سفر کے لیے نکلے اور آپ نے روزہ رکھا اور لوگوں نے بھی روزہ رکھ لیا جب "کراع الغمیم" کے مقام پر پہنچے تو آپ نے ایک پیالہ میں پانی منگایا اور اپنے ہاتھ میں اس کو اتنا اونچا اٹھایا کہ سب لوگوں نے دیکھ لیا اور اس سے آپ نے افطار کر لیا جب افطار ہو چکا تو آپ کو اطلاع موصول ہوئی کہ بعض لوگ تو اب بھی روزہ دار ہیں تو حضورؐ نے فرمایا۔

"یہی لوگ ہیں جو نافرمان ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو نافرمان ہیں" (مسلم)

دیکھیے! اس واقعہ سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ عبادت سراسر آپؐ کی پیروی کا نام ہے۔ آپ کے اتّباع میں روزہ رکھا جائے تو عبادت اور آپ کے اتباع میں روزہ

توڑ دیا جائے تو بھی عبادت۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روزہ توڑنے کے بعد بھی اگر کوئی شخص روزہ پورا کر لیتا ہے تو بظاہر کوئی قباحت محسوس نہیں ہوتی بلکہ اُلٹا ثواب ملنے کا گمان ہوتا ہے لیکن اسلام نے اتنی سی بات کو بھی گوارا نہیں کیا اور صاف اعلان کر دیا کہ یہ زہد و اتقا نہیں، بلکہ خدا کی نافرمانی ہے اقبال مرحوم نے ٹھیک کہا۔

بمصطفٰی برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است

اسلام میں اطاعتِ رسول کتنی اہمیت رکھتی ہے، اسے معلوم کرنا ہو تو صحابہؓ کی زندگی پر نظر ڈالیے اَطِیعُوا اللّٰہَ وَاَطِیعُوا الرَّسُولَ سے قرآن کے مخاطبینِ اول نے جو کچھ سمجھا تھا وہ صرف اتنا تھا کہ اپنے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سانچے میں ڈھال دو۔ وہ جس بات کے کرنے کا حکم دیں اسے کرو اور جس سے رکنے کا فرمائیں اس سے رُک جاؤ۔ وہ قرآن کے اس فرمان کی جیتی جاگتی تصویر تھے کہ وَمَا اٰتٰکُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا۔ رسول اللہؐ تمھیں جو دیں اسے لے لو اور جس سے منع کر دیں اس سے رک جاؤ۔ یہ علمِ دین کی راز دار ہستیاں یہی نہیں کہ اوامر و نواہی میں حضورؐ کی اطاعت کو فرض سمجھتی تھیں، بلکہ آپؐ کی ایک ایک ادا کا اتّباع ان کے لیے سرمایۂ حیات تھا۔

"حضرت عمارہؓ بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے بشر بن مروان کو دیکھا کہ وہ منبر پر خطبہ میں اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے ہوئے ہے۔ یہ دیکھ کر انھوں نے فرمایا خدا تعالیٰ ان دونوں ہاتھوں کا ناس کرے کیونکہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تھا آپ تو اپنے ہاتھ کی صرف شہادت کی انگلی اٹھاتے تھے۔" (مسلم)

بات بظاہر چھوٹی سی ہے کہ منبر پر کھڑے ہو کر دونوں ہاتھ اٹھائے جائیں یا صرف ایک انگلی۔ مگر جب صحابی کی نظر سے آنحضورؐ کی ایک ادا گزر چکی تھی تو اس نے پسند نہ کیا کہ اس کے خلاف عمل کیا جائے اور یہ صرف حضرت عمارہؓ ہی پر موقوف نہیں خلفائے راشدینؓ

تک اگر کبھی اپنی پسند و ناپسند کو ذوقِ رسولؐ سے ہٹا ہُوا پاتے تو بے قرار ہو ہو جاتے۔ امام شعرانیؒ نے حضرت فاروقِ اعظمؓ کے عہدِ خلافت کا ایک واقعہ درج کیا ہے کہ ایک مرتبہ آپ کو اطلاع ملی کہ بعض کپڑے بولِ عجائز سے رنگے جاتے ہیں۔ بولِ عجائز پتّوں سے بنا ہوا ایک خاص قسم کا رنگ تھا، تو آپ نے ایسے کپڑے اتار دینے کا حُکم جاری کرنے کا ارادہ کیا۔ وجہ ناپسندیدگی یہ تھی کہ بولِ عجائز عربی میں اونٹنی کے پیشاب کو کہتے ہیں لیکن جب آپ کو دوسرے صحابہ کے ذریعے معلوم ہوا کہ بولِ عجائز میں رنگے ہوئے کپڑے خود جنابِ رسالتمآب نے پہنے ہیں تو آپ فوراً اپنے اس ارادہ سے باز آ گئے اور اپنے پہلے ارادہ کو فسخ ہی نہیں کیا بلکہ اس پر بار بار استغفار کیا۔

شریعت کھانے پینے کے دائرے میں حلال و حرام کا تعین کر کے انسان کو آزاد چھوڑ دیتی ہے کہ وہ حلال چیزوں میں سے جس چیز کو چاہے کھائے پیئے مگر صحابہؓ کا ذوقِ اطاعت اتنا بڑھا ہوا تھا کہ اگر انھیں کبھی یہ معلوم ہو جاتا کہ حضورؐ نے فلاں کھانے کی چیز کو پسند کیا ہے تو اس کے بعد انھیں بھی وہ چیز مرغوب ہو جاتی۔ حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ ایک صحابی نے آنحضورؐ کے لیے کچھ کھانا تیار کیا اور آپ کی دعوت کی۔ میں بھی حضورؐ کے ہمراہ تھا۔ صاحبِ خانہ نے جَو کی روٹی کے ساتھ جو شوربا پیش کیا۔ اس میں لوکی کے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے میں نے دیکھا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم لوکی کے ٹکڑے پیالے میں چاروں طرف تلاش کر رہے ہیں۔ بس اس دن سے لوکی مُجھے محبوب ہو گئی اور اس کے بعد جس سالن میں بھی لوکی ڈلوا سکتا تھا ضرور ڈلواتا۔

آپ لوکی کھائیں یا نہ کھائیں۔ اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا مگر حضرت انسؓ کو دیکھیے کہ اطاعتِ رسُولؐ کا شوق انھیں کہاں تک لے گیا ــــ حقیقت یہ ہے کہ صحابۂ کرامؓ حضورؐ کی اطاعت میں بالکل متفق و یک رائے تھے۔

فصل ۱۶

محبّتِ رسولؐ

جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا لازمی نتیجہ اطاعت ہے ، اور اطاعت کے بغیر محبتِ رسولؐ معتبر قرار نہیں پاتی ۔ اسی طرح اطاعت بھی اس وقت تک قبول نہیں ہے جب تک اس میں محبت شامل نہ ہو ۔ یہی وجہ ہے کہ عارفانِ شریعت نے "اطاعت کے بغیر محبّت" اور "محبّت کے بغیر اطاعت" ۔۔ ہر دو صورتوں کو بدعت قرار دیا ہے ۔ اگر کوئی شخص حضورؐ کی محبّت کا دم بھرتا ہے لیکن آپ کے احکام کی اطاعت نہیں کرتا تو کوئی بھی معقول آدمی اس کے دعوائے محبت کو سچا نہیں سمجھے گا ۔ عشق کا اولین تقاضا ہی یہ ہے کہ محبوب کے ہر اشارۂ ابرو پر سرِ تسلیم خم کر دیا جائے ۔

عاشقی چیست ؟ بگو بندۂ جاناں بودن
دل بدستِ دگرے دادن و حیراں بودن

اور اسی طرح اگر کوئی شخص اطاعت میں تو بڑی سرگرمی دکھاتا ہے لیکن اس کا دل عشق و محبت کے جذبات سے خالی ہے تو یہ ایسی بات ہوگی جیسے ایک چھلکے سے مغز نکال کر اسے بے کار کر دیا جائے وہ اصحابِ فہم و بصیرت جو "محبّت کے بغیر اطاعت"

کو منافقت گردانتے ہیں غور کیا جائے تو ان کا نظریہ بڑی حد تک صحیح نظر آتا ہے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کسی خارجی دباؤ کے تحت مطیع و فرمانبردار بنا رہتا ہے لیکن دراصل اس کے داخل میں خوئے تسلیم و رضا کا نام و نشان تک نہیں پایا جاتا۔ جونہی وہ بیرونی دباؤ ختم ہوتا ہے تسلیم و انقیاد کی بجائے طبیعت پھر سرکشی پر آمادہ ہو جاتی ہے اسی لیے اسلام میں اطاعتِ رسول کے ساتھ ساتھ محبتِ رسول پر بھی بہت زور دیا گیا ہے۔ خود حضورؐ نے فرمایا۔

"تم میں کوئی مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اسے اپنے بیٹے باپ اور تمام لوگوں سے زیادہ پیارا نہ ہو جاؤں۔"

بیٹے اور باپ کی محبت تقاضائے طبیعت ہے لیکن حضورؐ کی محبت عقل و وجدان کی طلب ہے۔ اسی لیے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے فرمایا کہ کمالِ ایمان یہ ہے کہ تقاضائے عقل تقاضائے طبیعت پر غالب آجائے ۔ اور عقلی تقاضے طبعی تقاضوں پر تب غالب آتے ہیں، جب یہ جذبات میں رچ بس کر خود انسان کی طبیعت ثانیہ بن جائیں اور رگ و پے میں خون بن کر گردش کرنے لگیں۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت محض ظاہر میں سر کا جھکاؤ ہی نہیں چاہتی بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے غایت درجہ کے جذباتی لگاؤ کا بھی مطالبہ کرتی ہے۔

بخاری میں حضرت عبداللہ بن ہشامؓ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں۔

كُنَّا مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ آخِذٌ بِيَدِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَقَالَ لَهُ عُمَرُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ لَأَنْتَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ إِلَّا مِنْ نَفْسِي فَقَالَ لَا وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهٖ حَتّٰى

یعنی ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، آپؐ عمرؓ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے تھے۔ عمرؓ نے آپ سے عرض کیا یا رسول اللہ آپ مجھے اپنی جان کے سوا ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں، آپ نے فرمایا۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ

اَكُوْنَ اِلَيْكَ مِنْ نَفْسِكَ فَقَالَ عُمَرُ فَاِنَّكَ الْاٰنَ وَاللّٰهِ اَحَبُّ اِلَيَّ مِنْ نَفْسِيْ فَقَالَ الْاٰنَ يَا عُمَرُ۔

میں میری جان ہے جب تک میں تم کو اپنی جان سے بھی زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں تم مومن نہیں ہو گے۔

اسی محبت آمیز تنبیہ کا اثر تھا کہ اسے سنتے ہی حضرت عمرؓ نے اعلان کر دیا کہ۔

"اب آپ مجھے جان سے بھی زیادہ عزیز ہو گئے۔"

یہ محبت اتنی بڑھی کہ تاریخ بتاتی ہے رسولِ پاکؐ کی وفات کے بعد جب حضرت عمرؓ کو رسولِ پاک کا زمانہ یاد آتا تو رونے لگتے اور روتے روتے بے ہوش ہو جاتے ـــــ یہی حضرت عمرؓ تھے کہ تنخواہوں کے تقرر کے وقت ان کے بیٹے حضرت عبداللہؓ نے ان سے شکایت کی۔" اباجان میری تنخواہ تھوڑی اور حضرت اسامہؓ کی زیادہ ہے حالانکہ میں ان سے کسی معاملے میں پیچھے نہیں ہوں تو حضرت عمرؓ نے جواب دیا۔

لِاَنَّ زَيْدًا كَانَ اَحَبَّ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ اَبِيْكَ وَكَانَ اُسَامَةُ اَحَبَّ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْكَ۔

"بیٹا! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو (اسامہؓ کے والد) حضرت زیدؓ تیرے والد سے زیادہ پیارے تھے اور خود اسامہؓ تجھ سے پیارے تھے۔"

معلوم ہوا کہ محبت کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ محبوب جس چیز سے محبت رکھتا ہو۔ اس سے محبت کی جائے۔ یہی وہ اصول ہے جو ہمیں اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے جس میں حضورؐ نے اہلِ بیتؓ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا تھا۔

"اے اللہ میں ان سے محبت رکھتا ہوں تو بھی ان سے محبت فرما اور جو ان سے محبت کرے ان سے بھی محبت فرما۔" ایک اور جگہ فرمایا ہے

"عرب سے محبت رکھو اس لیے کہ میں عربی ہوں" اور یہ کہ "عرب سے بغض رکھو گے تو مجھ سے بھی بغض رکھنے لگو گے۔" (ترمذی)

وہ لوگ جو اسلام کو یبوست اور خشک مزاجی کا علمبردار بنائے ہوئے ہیں اور محبتِ رسولؐ کو دین و ایمان کا حصہ نہیں سمجھتے، انھیں صحابۂ کرامؓ کی زندگی کا مطالعہ کرنا چاہیے وہ دیکھیں گے کہ محبت اور انتہائی وارفتگی کے جو مناظر یہاں پائے جاتے ہیں وہ چشمِ فلک نے شاید ہی کہیں اور دیکھے ہوں۔

جنگِ اُحد کا واقعہ ہے۔ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہؓ نے دیکھا کہ کچھ فاصلہ پر ایک شخص زخموں سے چُور کراہ رہا ہے۔ آپ اس کے پاس پہنچیں، پانی پلایا، سانس اُکھڑ رہی تھی، لیکن اُمّ المؤمنین نے دیکھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ اس نے کہا۔

"اللہ کے رسولؐ — ان پر خدا کی رحمتیں ہوں! کاش ان کو یہ پیغام پہنچا دیا جائے کہ ان کا غلام زیادؓ دنیا سے رخصت ہو رہا ہے۔"

اُمّ المؤمنین بارگاہِ رسالت میں پہنچیں، زیادؓ کا پیغام دیا، آپ بے قرار ہو کر تشریف لائے۔ آتے ہی فرمایا۔ "زیادؓ آنکھیں کھولو! دیکھو میں آگیا ہوں۔" زیاد کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ حضورؐ نے پوچھا۔ "زیادؓ کوئی آخری تمنا؟" اور زیاد نے عرض کیا۔ "حضورؐ! صرف ایک تمنا ہے۔" اور انھوں نے جسم کو آگے گھسیٹ کر اپنا سر حضورؐ کے قدموں پر رکھ دیا۔ ان کے ہونٹ آہستہ آہستہ حرکت کر رہے تھے۔

رَضِیْتُ بِاللّٰہِ رَبًّا وَّ	اللہ تعالیٰ سے رب ہونے کے باعث
بِالْاِسْلَامِ دِیْنًا وَّ بِمُحَمَّدٍ	اور اسلام سے دین کے طور پر اور محمدؐ سے
نَبِیًّا۔	نبی کی حیثیت سے راضی ہوں۔

احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات ایک آدمی مختلف وجوہ و اسباب کی بنا پر اطاعت میں کامل نہیں ہوتا۔ اس سے کبھی کبھی گناہ بھی سرزد ہو جاتے ہیں لیکن چونکہ اس کے دل میں اللہ اور رسولؐ کی محبت ہوتی ہے۔ اس لیے وہ راندۂ درگاہ نہیں ہونے پاتا۔ اور گناہوں کے باوجود اس کی طرف اسلام کی چشمِ التفات قائم رہتی ہے۔

حضرت عمر فاروقؓ راوی ہیں کہ حضورؐ کے زمانے میں عبداللہ نامی ایک شخص تھا جس کا لقب حمار تھا وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہنسایا کرتا تھا۔ ایک دفعہ شراب نوشی کی وجہ سے اسے کوڑے بھی لگ چکے تھے ایک دن پھر اسی الزام میں پکڑا ہوا آیا۔ حضورؐ نے اُسے کوڑے لگانے کا حکم دیا۔ اسے کوڑے لگ چکے، تو ایک شخص کہنے لگا۔ اے خدا! یہ بار بار شراب پینے کی وجہ سے پکڑا جاتا ہے، اس پر لعنت فرما! حضورؐ نے سنا تو فرمایا۔

لَا تَلْعَنُوْهُ فَوَاللّٰهِ مَا عَلِمْتُ اِلَّا اَنَّهٗ يُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ	اس پر لعنت مت برساؤ! بخدا میں جانتا ہوں کہ یہ خدا اور اس کے رسولؐ سے محبت رکھتا ہے۔

اس واقعہ سے واضح طور پر یہ بات ثابت ہو گئی کہ اسلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محض اطاعت ہی کا تعلق جوڑنے کا حکم نہیں دیتا بلکہ مسلمانوں کے دلوں میں آپ کے لیے محبت کے لطیف جذبات بھی پیدا کرنا چاہتا ہے، اور اسے یہ بھی مطلوب ہے کہ حضورؐ کا نام آنے پر صدیق اکبرؓ کی طرح دلوں میں ہلچل پیدا ہو جائے اور آنکھیں وفورِ جذبات سے بھیگ جائیں۔

وہ لوگ جو زاہد خشک تو بن گئے ہیں لیکن محبتِ رسولؐ کی اس دولت سے محروم ہیں، انھیں چاہیے کہ وہ ان واقعات کی تاویل کرنے کی بجائے اس مقامِ مطلوب و محبوب کو حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ ع

ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی

فصل ۱۷

سنّتِ رسولؐ

آپ قرآن کا مطالعہ کریں تو جگہ جگہ آپ کو ایسے مقامات نظر آئیں گے جہاں صرف مجمل حکم جاری کیا گیا ہے۔ اس کی کوئی تشریح و توضیح نہیں کی گئی۔ نماز، روزہ، حج زکوٰۃ جیسے بنیادی مسائل تک کے متعلق جن پر اسلام کا دارومدار ہے۔ کتاب، پاک میں مجمل احکام کے سوا کچھ نہیں۔ لہٰذا۔ نماز کی رکعتیں۔ اس کی ادائیگی کے طریقے۔ اسی طرح زکوٰۃ اس کا نصاب اور روزہ اور حج کی دوسری تفاصیل یہ ساری کی ساری باتیں ہمیں قرآن سے نہیں ارشاداتِ رسولؐ سے معلوم ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں مسلمانوں کو رسول اللہ کا اتباع کرنے کا حکم دیا گیا ہے کیونکہ ان کے اقوال و افعال سے روشنی حاصل کیے بغیر تعلیماتِ قرآنی پر عمل نہیں کیا جاسکتا۔ ارشادِ ربانی ہے۔

"کہہ دو (اے پیغمبر) اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میرا اتباع کرو۔ اللہ تم سے محبت کرے گا۔" (آل عمران - ۳۱)

یہ بھی بتادیا گیا کہ رسولِ خدا کے فرائضِ منصبی میں یہ بات بھی شامل ہے کہ وہ قرآن کی وضاحت اور تبیین فرمائیں، ارشاد ہوتا ہے۔

"ہم نے تیری طرف "الذکر" نازل کیا ہے تاکہ تو لوگوں کے لیے اس چیز کو واضح کرے جو ان کی طرف اتاری گئی ہے۔" (النحل)

اس تبیین و توضیح کے بغیر اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ وہ قرآن کو سمجھ لے اور اس کے جملہ احکام کی پیروی کرے تو یہ ایسے ہی ہوگا جیسے کسی بچے کو معلم اور اتالیق کے بغیر از خود کتابیں پڑھنے پر لگا دیا جائے۔ امام ابو حنیفہؒ جیسے فاضلِ روزگار کا قول ہے۔

"اگر حدیث نہ ہوتی تو ہم میں سے کوئی بھی قرآن کو نہ سمجھتا۔"

قرآن خاکم بدہن اگر شاعری کی کتاب ہوتا تو یہ بات اس کے محاسن میں شمار ہوتی کہ پیغمبر اس کی تشریح خود قارئین پر چھوڑ دے اور وہ اس کے بطن سے رنگا رنگ معانی برآمد کریں مگر جس قرآن نے افتراق و انتشار کو ختم کرنے اور اللہ کی رسی کو مضبوط تھامنے کا حکم دیا ہو اس کے احکام کے متعلق یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ پیغمبرِ خدا کی قولی و عملی تشریحات کو چھوڑ کر ہم اپنی رائے سے ان کا مفہوم متعین کرنے بیٹھ جائیں اور اس طرح اسے "شد پریشاں خواب من از کثرتِ تعبیرہا" کا مصداق بنا کر رکھ دیں۔ آج مسلمانوں میں جتنی چیزیں متفق علیہ ہیں، ان کی وجہ یہ ہے کہ وہاں سنّتِ رسولؐ سے اسلام اور قرآن کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگر آغازِ اسلام سے لے کر اب تک مسلمان سنّتِ نبوی سے بے نیاز رہتے تو ان کے درمیان شاید ہی کوئی قدرِ مشترک باقی رہتی۔ آج صلوٰۃ، زکوٰۃ، صوم، حج اور دوسری بے شمار اسلامی اصطلاحات سنتے ہی فی الفور ان کا ایک متعیّن مفہوم ذہن میں آجاتا ہے۔

یوں بھی انسان کی فطرت کا ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ وہ جس سے محبت کرتا ہو یا جس کی عظمت اور برتری کا قائل ہو اس کی اداؤں اور اس کی باتوں کو دل سے محو نہیں ہونے دیتا۔ جنھیں اس دور میں اقبال اور قائدِ اعظم مرحوم سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے آپ کبھی ان سے بات کریں تو آپ دیکھیں گے کہ وہ ان مرحوم اکابر سے سنی ہوئی ایک ایک بات کو مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں۔ ان کی گفتگو کا انداز، لباس وضع قطع ہر چیز ان

کے دماغ میں محفوظ ہے اخبارات و رسائل ان بزرگوں کی یادیں نمبر نکالتے ہیں تو ان لوگوں کے خیالات کو خاص اہمیت دی جاتی ہے اور قارئین ان چشم دیدہ واقعات کو نعمتِ غیر مترقبہ سمجھتے ہیں۔ اعاظمِ رجال کی باتیں ہم کیوں نہیں بھولتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی عظمت ہمارے دل پر نقش ہوتی ہے اور ہم ان کی زندگی کے ایک ایک جزئیہ کو احترام و عقیدت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ــــ یہی حال محبت کرنے والوں کا ہے انھیں محبوب کی ایک ایک ادا، متاعِ گراں بہا معلوم ہوتی ہے، وہ اس کی باتوں کو بھلانا چاہیں تب بھی اس میں کامیاب نہیں ہوتے۔ ع

بھلاتا لاکھ ہوں لیکن وہ اکثر یاد آتے ہیں

انسانی فطرت کی اس خصوصیت کو سامنے رکھ کر اب ذرا ایک لحظہ کے لیے صحابۂ کرامؓ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق پر غور کیجیے۔ جو شخصیت

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

کا مقام رکھتی ہو۔ اس کی عظمت کا کیا ٹھکانا ہے؟ دنیا نے احترام و عقیدت کے یہ انسانی مناظر کا ہے کو دیکھے ہوں گے کہ اسامہؓ بن شریک فرماتے ہیں کہ۔

"میں آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا کیا دیکھتا ہوں کہ آپؐ کے صحابہؓ آپؐ کے ارد گرد اس طرح بے حس و حرکت خاموش بیٹھے ہیں گویا ان کے سروں پر کوئی پرندہ گھوم رہا ہے۔" (ترمذی)

صحابہؓ کے دلوں میں عظمتِ رسولؐ کی گہرائیوں کا اندازہ کرنا ہو تو اس واقعہ سے کیجیے کہ حضرتِ انسؓ فرماتے ہیں۔

"میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ حجام آپؐ کا سر مونڈ رہا ہے صحابہؓ آپؐ کو گھیرے ہوئے بیٹھے ہیں اور مقصد صرف یہ ہے کہ جو بال آپؐ کے سر مبارک سے گرے وہ کسی نہ کسی کے ہاتھ پڑ جائے۔" (مسلم)

یہی وہ احساسِ عظمت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے عظیم پیغمبر کے سامنے اونچی آواز سے بولنے کو منع فرمادیا تو ایک صحابی ثابت بن قیسؓ اپنے گھر بیٹھ رہے اور آپؐ کی خدمت میں آنا جانا بند کر دیا۔ آپؐ نے سعد بن معاذؓ سے ان کا حال پوچھا وہ حضرت ثابتؓ کے پاس آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دریافت کرنے کا حال ان سے بیان کیا۔ ثابتؓ بولے کہ

"اونچی آواز سے بولنے کی ممانعت نازل ہو چکی ہے اور تم لوگ جانتے ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں تم سب میں زیادہ میری ہی آواز بلند ہو جاتی ہے تو مجھے ڈر یہ ہے کہ میں کہیں دوزخی نہ ہو جاؤں۔"

یہ تو صحابۂ کرامؓ کے دلوں میں دنیا کے اس سب سے بڑے انسان کی عظمت کا عالم تھا۔ محبت کا جائزہ لیا جائے تو اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں ذرہ برابر تامل نہیں ہوتا کہ عشق و محبت کی جو لافانی مثالیں ہمیں یہاں نظر آتی ہیں تاریخ کے صفحات ان کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہیں ——— عروہؓ بن مسعود ثقفی ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے کہ صلحِ حدیبیہ کے موقع پر قریش کے سفیر بن کر آئے۔ واپس گئے تو قریش کے سامنے صحابہؓ کی محبت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا۔

"لوگو! خدا کی قسم مجھے بادشاہوں کے دربار میں بھی باریابی کا موقع ملا ہے۔ قیصر و کسریٰ اور نجاشی کے سامنے حاضر ہوا ہوں، قسم خدا کی میں نے کسی بادشاہ کو نہیں دیکھا جس کی لوگ اتنی عزت کرتے ہوں جتنی محمدؐ کے ساتھی محمدؐ کی کرتے ہیں، قسم خدا کی جب وہ بلغم تھوکتے ہیں تو نہیں گرتا ہے لیکن ان کے ساتھیوں میں سے کسی آدمی کے ہاتھ میں، پھر وہ اپنے چہرہ اور اپنے بدن پر اسے مل لیتا ہے، محمدؐ جب کسی بات کا انھیں حکم دیتے ہیں تو اس کی تعمیل کی طرف جھپٹ پڑتے ہیں، جب محمدؐ بات کرتے ہیں تو ان کی آواز یں پست ہو جاتی ہیں، محمدؐ کو نگاہ بھر کر ان کی عظمت کی وجہ سے

وہ نہیں دیکھ سکتے۔" (بخاری)

حضرت عبداللہ بن زیدؓ جو صاحب الاذان کہے جاتے تھے اپنے باغ میں کام کر رہے تھے کہ انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کی خبر معلوم ہوئی۔ اسی وقت انھوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے اور کہا اے اللہ مجھے نابینا کر دے کہ ان آنکھوں سے اب کسی کو نہ دیکھ سکوں۔

یہ رسول اللہؐ سے صحابہؓ کے تعلق کی چند جھلکیاں ہیں۔ جو اصحاب تفصیلات چاہتے ہوں وہ احادیث و سیر کی کتابیں اٹھا کر دیکھیں۔ انھیں معلوم ہو گا کہ حضورؐ اپنے متبعین کی نظر میں کتنے محبوب اور کتنے باکمال و صاحبِ عظمت تھے ــــ اس تعلق کو پیش نظر رکھیے اور اس کے بعد انصاف سے کہیے کہ کیا یہ ممکن تھا کہ صحابہؓ اپنے محبوب و عظیم رہنما کو قریب سے دیکھتے، ان کے ارشادات سنتے اور پھر ان ساری باتوں کو بھلا دیتے۔ جو شخص ہمارے سامنے یہ عجیب و غریب اور مضحکہ انگیز خیال پیش کرتا ہے اس کے بے عقل اور بے مغز ہونے میں کیا کوئی شبہ کیا جا سکتا ہے؟

پھر یہی نہیں کہ آپ کے تذکروں میں صرف صحابہؓ کا داخلی احساس کارفرما ہے بلکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی۔

"ان باتوں کو یاد رکھو اور جو لوگ تمہارے پیچھے ہیں انھیں ان سے مطلع کرتے رہنا۔"

اسی پر بس نہیں۔ حضورؐ منٰی کے میدان میں ایک لاکھ صحابہؓ کے مجمع کو خطاب فرماتے ہیں۔ اور انھیں رغبت دلاتے ہیں۔

"تر و تازہ رکھے اللہ اس بندے کو جس نے میری بات سنی پھر اسے یاد رکھا اور جس نے نہیں سنا ہے اس تک اسے پہنچا دیا۔"

اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جب داخلی احساسِ عظمت و محبت کے ساتھ ساتھ خارج

سے اس عظیم محبوب شخصیت کی یہ تاکید بھی شامل ہوگئی ہوگی تو صحابہؓ نے کس ذوق وشوق سے احادیثِ رسولؐ کی اشاعت کی ہوگی۔ اشاعتِ حدیث کے نتیجے میں طلبِ حدیث کی پیاس کا پیدا ہونا ایک قدرتی امر تھا اور طلبِ حدیث کا یہی وہ ذوق وشوق ہے جس کی ایک مثال خود حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ نے بیان کی ہے — آپ فرماتے ہیں۔

"میں حدیث کی طلب میں کسی ایسے آدمی کے پاس جاتا۔ جس کے متعلق مجھے خبر ملتی کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ سنا ہے اور پاتا کہ وہ دوپہر میں آرام کر رہے ہیں تو اپنی چادر کو تکیہ بنا کر ان کے دروازے پر پڑ جاتا۔ ہوائیں دھول اڑا اڑا کر میرے چہرے پر ڈالتیں اور میں اسی حال میں پڑا رہتا تا ایں کہ خود وہ صاحب باہر نکل آتے، باہر نکل کر جب وہ مجھے دیکھتے تو کہتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عم زادے! آپ کیسے تشریف لائے ہیں۔ میں کہتا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ حضور سے تم کوئی حدیث بیان کرتے ہو۔ میں نے چاہا کہ اس حدیث کو تم سے سنوں، جواب میں وہ صاحب کہتے۔ آپ نے کسی کو بھیج دیا ہوتا میں خود حاضر ہو جاتا، میں کہتا کہ تمھارے پاس حاضر ہونے کا مستحق میں ہوں۔" (دارمی)

فصل ۱۸

تدوینِ حدیث

یہ کوئی مبالغہ نہیں ہے، امرِ واقعہ ہے کہ ایک ہزار سال پہلے کی دنیا کی کوئی قوم بھی تو ایسی نہیں ہے جو یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکے کہ اس کی مذہبی روایات کی تدوین، جدید انداز کی تاریخ نویسی کے معیار پر پوری اترتی ہے۔

میرا دعویٰ ہے کہ اسلام کے سوا، کسی دوسری قوم کو یہ شرف قطعاً نصیب نہیں ہوا ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ حدیث و تاریخ نویسی کی ایجاد و اختراع ہی مسلمان محدّثین و مؤرخین کی ہے۔ کسی بھی قوم نے اسلام سے پہلے، تاریخ نویسی کا وہ پاکیزہ انداز قطعاً اپنایا نہ تھا جو عرب مؤرخین و محدّثین نے اپنایا۔

محدّثین و مورخینِ اسلام نے اس سلسلہ میں جو محنت و کاوش کی۔ جس جستجو اور اور ذوق و شوق سے کام لیا اس کی مثال قدیم دنیا میں کہیں بھی موجود نہیں ہے۔ اوّل تو دنیا کی اقوام میں سے کسی ایک قوم نے بھی اپنے پیغمبر کے عہد میں، اس کی زندگی اور اس کے طور و طریق کو کوئی اہمیت دی ہی نہیں ہے۔

یہ مہاتما بدھ ہوں یا جنابِ موسیٰؑ و عیسیٰؑ ان کی ہر عظمت کے باوجود، ان کے

ساتھیوں اور ان کے پیروکاروں نے ان کے اقوال و فرمودات اور طور طریق کو روایت کی شکل دینے پر، کئی سو سال تک توجہ ہی مبذول نہیں کی تھی، نہ مہاتما بدھ کے ساتھیوں نے مہاتما بدھ کی زندگی کو ان کے عہد میں قلمبند کیا۔ نہ جنابِ موسیٰؑ کے رفقاء نے ایسی تکلیف گوارا کی اور جنابِ عیسیٰؑ کے حواری تو بے چارے تعداد میں صرف بارہ تھے اور ایسی اسناد موجود ہیں کہ انھوں نے کوئی بات بھی جنابِ عیسیٰؑ کی قلم بند نہ کی تھی۔ اس کے برعکس کتنی ہی ایسی تحریری اسناد اس بات کا ثبوت ہیں کہ حضور سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے کتنے ہی ساتھی ایسے تھے جو حضورؐ کے فرمودات و ارشادات کو لکھ لیتے تھے۔

اور ان ساتھیوں نے حضورؐ کے یہ تحریری ارشادات و فرمودات تحریر ہی کی شکل میں اگلی نسل کے سپرد کیے اور ایسے صحابۂ کرامؓ کی تعداد تو ہزاروں ہزار ہے جنھوں نے حضورؐ کے ارشادات، حضورؐ کے اقوال اور ایک ایک فعل اور ایک ایک عمل کے بارے میں چشم دید کیفیت، اپنے لاکھوں شاگردوں کو لکھوائی اور انھوں نے پھر آگے مزید لاکھوں افراد تک یہ متاعِ گراں بہا پہنچائی۔

یہاں یہ اظہار بھی بے موقع نہیں ہے کہ حضور سرورِ کون و مکاں اس دنیا کے پہلے نبی ہیں جن کی زندگی میں ان کے پیروکاروں کی تعداد لاکھوں سے متجاوز کر گئی تھی اور یہ لاکھوں افراد وہ تھے جنھوں نے حضورؐ کا پیغام حضورؐ کی زبانِ مبارک سے سننے کا فخر حاصل کیا تھا۔

مورخ القسطلانی نے بڑے اعتماد کے ساتھ دعویٰ کیا ہے کہ حضور نے جب آخری حج کیا تو دو لاکھ کے قریب مسلمان اس حج میں شامل ہوئے تھے اور ان سب نے میدانِ عرفات میں حضورؐ کا وہ خطبہ سنا تھا جو خطبۂ حجۃ الوداع کے عنوان سے تاریخ میں محفوظ ہے۔ گویا یہ سارے کے سارے حضرات اس خطبہ کے چشم دید گواہ ہیں۔ اور یہ امر یقینی

ہے کہ ان لاکھوں لوگوں نے حضورؐ کے خطبہ اور حج کی روداد آگے روایت کی اور حضورؐ کے بارے میں اپنے بچوں، اپنے قبیلہ کے لوگوں اور دوسروں کو بہت کچھ کہا۔

اور یوں حضورؐ جب اس دنیا سے رخصت ہوئے تو ان کی عادات و اطوار اور اسلام کی اصولی باتوں کا علم، لاکھوں لاکھ انسانوں کو ہو چکا تھا۔

مورخ عبدالحکم اور دوسرے پہلے مورخین نے دعویٰ کیا ہے کہ حضورؐ جب اس دنیا سے رخصت ہوئے تھے تو حضورؐ کے صحابہ کی اکثریت ایک ایسی جماعتِ معلمین کی شکل اختیار کر گئی تھی، جس کی زندگی کا مشن حضورؐ کی تعلیمات کو عام کرنے کے سوا کوئی اور نہ تھا۔ ایک ایک صحابی کا آستانہ حدیثِ نبوی کی درس گاہ بن گیا تھا اور ان کی خدمت میں حاضری دینے والے لاکھوں مسلمان ان کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے کو زندگی کا حاصل جانتے۔

کوئی کیمرہ میرے پاس ایسا نہیں جس کے ذریعہ سے ان مناظر کی عکاسی کر سکوں، جبکہ ایک ایک صحابی کے حضور ہزاروں طلبا حاضر ہوتے، ان کے ہاتھوں میں قلم دوات کے ساتھ ساتھ ایسے قرطاس بھی ہوتے جن پر وہ اپنے استاد کی بیان کی ہوئی روایت اسی وقت قلم بند کر لیتے تھے

تابعین کے عہد میں یہ شوق اور بڑھا۔

تاریخ کہتی ہے کہ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ اُدھر بادشاہ کا جلوس جا رہا ہے کہ اچانک شور اٹھا کہ فلاں تابعی اور فلاں محدث آن پہنچے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے بادشاہ کے جلوس کی نفری گھٹ جاتی۔ ہزاروں کا مجمع چھٹ جاتا اور یہ سب لوگ محدثؒ کی طرف دوڑ پڑتے تھے۔

مورخ الطبری کہتے ہیں کہ ایک بار ہارون الرشید عباسی بادشاہ خراسان کے کسی مقام پر خیمہ زن تھا۔ ہزاروں لوگ اس کے گرد جمع تھے کہ اچانک کسی نقیب

نے ہانک لگائی کہ حضرت عبداللہ بن مبارک تشریف لے آئے ہیں۔

اس آواز کا اٹھنا تھا کہ ہارون الرشید کی خیمہ گاہ آدمیوں سے خالی ہوگئی۔ کہاں وہاں ہزاروں لوگ جمع تھے اور کہاں اب وہاں صرف چند درباری رہ گئے تھے۔ سارے کے سارے جناب عبداللہ بن مبارک کی سمت دوڑ پڑے تھے۔ ہارون الرشید بہت بوکھلایا۔ ایک اونچی جگہ پر چڑھا اور اس سمت نگاہ کی۔

انسانوں کا ایک سمندر تھا جو جناب عبداللہ بن مبارک کی سواری کے گرد جمع تھا۔

ہارون الرشید چیخا۔

"اصل بادشاہ تو وہ ہے"

اصل بادشاہ وہ نہ تھے اصل بادشاہ وہ ذاتِ پاک تھی جن کی حدیثیں جناب عبداللہ بن مبارک لوگوں کو سناتے تھے۔

اور اس ذاتِ پاک کی حدیثیں ان دنوں، عرب، عراق، ایران، شام، مصر اور افریقہ کے کروڑوں لوگوں کو اس درجہ عزیز تھیں کہ لوگ سینکڑوں میلوں کا سفر اختیار کر کے ان محدثین کی خدمت میں حاضری دیتے، جن کے سینے ان سے منور تھے۔

تاریخِ حدیث کے مؤلفین کا بیان ہے کہ یوں تو حدیث کی تدوین پہلی صدی ہجری کے نصفِ آخر ہی میں شروع ہوگئی تھی مگر اسے ایک باقاعدہ اہتمام کی شکل حضرت عمر بن عبدالعزیز کے عہد میں ملی۔

مؤرخ عبدالحکیم کہتے ہیں کہ یہ جناب عمر بن عبدالعزیز تھے جنھوں نے سرکاری حیثیت سے تدوینِ حدیث کا حکم جاری کیا تھا اور مدینہ کے سب سے بڑے محدثین کو ہدایت کی تھی کہ ایک مجموعۂ احادیث ان کے لیے خصوصی طور پر تیار کیا جائے جس کی تعمیل ہوئی۔ یوں یہ سہرا حضرت امام مالک کے سر بندھا ہے کہ انھوں نے مستند احادیث کا ایک ایسا مجموعہ تیار کیا جس کی صحت، ہر شبہ سے بالا تھی۔ یہ مجموعۂ حدیث

آج بھی ہر اسلامی لائبریری کی زینت ہے۔ اور اس نے موطا امام مالک کا نام پایا ہے۔

موطا امام مالکؒ کے بارے میں مالکی محدثین نے دعویٰ کیا ہے کہ اسے جناب امام مالکؒ سے جن لوگوں نے خود سنا تھا ان کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہو کر لاکھوں تک پہنچ گئی تھی اور جب یہ موطا حضرت امام مالکؒ کے شاگرد جناب یحییٰؒ کے ذریعہ اندلس پہنچا تو اسے پڑھنے اور سننے والوں کی تعداد لاکھوں سے بھی متجاوز ہو گئی۔

امام مالکؒ کے علاوہ ان کے عہد میں، مدینہ کے جن محدثین نے احادیث کے مجموعے تیار کیے تھے ان میں ابنِ ہشام، ابنِ اسحاق اور ابنِ سعد کے اسما سرِفہرست ہیں۔ موطا کی طرح ان بزرگ محدثین کے مرتب کردہ مجموعے بھی اس وقت تمام اسلامی لائبریریوں میں موجود ہیں۔ عباسی دور میں قرآن کے بعد حدیثؐ کی تدوین اس قدر محبوب تھی کہ ہزاروں علما نے حدیث کے مجموعے مرتب کیے اور ان کا حلقۂ اشاعت بے حد وسیع تھا۔

اس دور کے محدثین میں سے جن بزرگوں نے شہرتِ دوام حاصل کی اور حدیث کے مجموعے اپنے اپنے طور پر مرتب کیے ان میں ابن جریجؒ، ربیعؒ بن صبیح، سعیدؒ بن ابی عروبہ، حمادؒ بن سلمہؒ، امام سفیان ثوریؒ، امام اوزاعیؒ، امام ہیثمؒ، معمرؒ، جریرؒ بن عبدالحمید، عبداللہؒ بن مبارکؒ، عبیداللہؒ بن موسیٰؒ، مسددؒ بصری، اسدؒ بن موسیٰ، نعیم بن حماد، امام احمدؒ بن حنبل، امام اسحاقؒ بن راہویہ اور عثمانؒ بن ابی شیبہ تھے۔

ابن الندیم کے بیان کے مطابق امام سفیان ثوری کے مجموعہ کا نام الجامع الکبیر اور الجامع الصغیر تھا۔ محدث ابو عبدالرحمٰن نے کتاب السنن تالیف کی تھی۔ ابن ابی الزناد نے کتاب الفرائض، محدث عبدالملک نے کتاب المغازی اور محدث وکیع نے کتاب السنن لکھی۔

ابن ابی عروبہ، الولید بن مسلم، امام عبدالرزاق اور امام مکحول، المروزی، احمد

بن محمد ہانی، علی بن مدینی، المعمری، ابن ابی حیثمہ، مسلم بن حجاج، یحیٰی بن معین، ابراہیم الحربی، ابن ایوب، ابو مسلم، ابن ابی داؤد، جعفر الدقاق، محمد بن مخلد، ابو عبداللہ الحسین بھی جامعین حدیث میں سے تھے۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے طور پر احادیث جمع کی تھیں اور انھیں کتابی شکل دی تھی۔

امام الذہبی، ابن الجوزی اور السبکی نے ان محدثین کی تعداد کئی سو بتائی ہے، جنھوں نے احادیث کے مجموعے مرتب کیے تھے اور حدیث کی جانچ پڑتال اور میزان و اعتدال میں محنتِ شاقہ کی تھی۔

جن محدثین کے سر پر پروردگار نے شہرتِ دوام کا خصوصی تاج رکھا ان میں سرِ فہرست حضرت امام مالکؒ، حضرت امام احمد بن حنبلؒ، حضرت امام بخاریؒ، حضرت امام مسلمؒ، حضرت امام ترمذیؒ، حضرت امام نسائیؒ، حضرت امام ابوداؤد، جنابِ ابنِ ماجہ، جنابِ دارقطنی، محدث البیہقی، محدث الطحاوی اور محدث الحاکم ہیں۔

ان سب کے مجموعے قبولِ عام کی سند حاصل کر چکے ہیں اور ہر لائبریری اور ہر اسلامی مکتب میں موجود ہیں۔

۱۔ تواترِ طبقہ عن الطبقہ

وہ احادیث جنھیں صحابہؓ سے تابعین اور تبع تابعین بغیر کسی اختلاف کے ایک دوسرے سے روایت کرتے ہیں — قرآن بھی اسی تواتر سے ہم تک پہنچا ہے۔

۲۔ تواترِ عمل

جیسے نماز کے پانچ اوقات، اذان اور رکعاتِ نماز۔

۳۔ تواترِ اسناد

بہت سی سندوں کے ذریعے ایک حدیث کی روایت جیسے اَلْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ

کی حدیث ۰۰ے سندوں سے مروی ہے یا احادیث ختمِ نبوت کہ ایک سو پچاس صحابہ نے ان کی روایت کی ہے۔

۴۔ تواترِ قدرِ مشترک

مثلاً معجزات، کی احادیث کہ ان میں سے ہر ایک واقعہ تو خبرِ واحد ہے لیکن ان احادیث کی قدرِ مشترک یہ ہے کہ خارقِ عادات کا صدور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔

غیر متواتر احادیث میں سے بھی اکثر آٹھ آٹھ دس دس راویوں کی بیان کردہ ہیں، پھر ـــــ محدّثینِ کرام نے (اللہ تعالیٰ انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے) حدیث کے فنِ تاریخ کو مزید نکھارنے کے لیے جو حیرت انگیز محنت کی ہے غیر مسلم اسکالر بھی اسے دیکھ کر دنگ رہ گئے ہیں۔ صرف حفاظتِ حدیث کے لیے حضراتِ محدّثین نے ۵۲ علوم مدوّن کیے ہیں جنھیں دیکھنے کے بعد کوئی عقل دشمن ہی احادیث کی صحت کے بارے میں شبہات کا شکار ہو سکتا ہے۔

ذیل میں چند بنیادی علوم کا ذکر کر رہا ہوں۔

۱۔ علم مصطلح الحدیث

یعنی وہ علم جو حدیث کی بنیادی اصطلاحات سے متعلق ہے۔

۲۔ علم الجرح والتعدیل

اس علم کے ذریعہ بڑے محدّثین نے حدیث کے راویوں پر جرح کی ہے۔ ان کے کردار، ان کے عمل اور فعل، یہاں تک کہ گفتار کو زیرِ بحث لائے ہیں اور حتی الوسع کسی بھی راوی کو میزانِ عدل میں تولے بغیر نہیں رہے اس سلسلہ میں مشہور تصانیف توجیہہ النظر اور قواعد الحدیث ہیں۔

۳۔ علم اسماء الرّجال

یہ حدیث کا سب سے بڑا علم ہے اور محدّثین نے اس سلسلہ میں اس قدر محنت کی کہ عمریں بتا دیں اور کئی کئی جلدوں پر مشتمل تالیفات آنے والی نسلوں کے سپرد کیں۔

محدّث ابنِ سعد اس علم کے پہلے بانی ہیں۔ اور ان کی طبقات، علم اسماء الرّجال کی پہلی معیاری تصنیف ہے۔ ابنِ سعد، امام مالکؒ، مؤرّخ ابنِ اسحاق، الواقدی اور ابنِ ہشام کے ہم عصر ہیں اور مرتبہ کے لحاظ سے امام مالکؒ کے بعد ان ہی کا درجہ ہے۔

ان کی کتاب طبقاتِ ابنِ سعد کے عنوان سے، ہر اسلامی لائبریری کی زینت ہے۔ اس میں صحابہ اور بزرگ تابعین اور تبع تابعین کے نام، اور ان کے ضروری حالات درج ہیں۔ اور اس کی کئی جلدیں ہیں۔

ابنِ سعد کے بعد، یوں تو عباسی دور اور بعد کے ادوار میں یہ موضوع علمائے حدیث کا پسندیدہ و منتخب موضوع تھا۔ تاہم اس موضوع پر جو کتابیں ہر دلعزیزی کے سارے ریکارڈ توڑ گئیں وہ امام بخاریؒ کی التاریخ الکبیر، امام ابنِ حجر کی لسان المیزان اور امام الذہبی کی تصانیف تذکرۃ الحفاظ، طبقات المشاہیر اور میزان الاعتدال اور المعارف لابن القتیبہ، المنتظم لابن الجوزی، تہذیب الاسماء للنووی، الخطیب کی تاریخِ بغداد اور ابنِ عبدالبر کی الاستیعاب اور السبکی کی طبقات الشافعیہ ہیں۔

۴۔ احادیث الموضوعہ

موضوع احادیث کو الگ چھانٹ دیا گیا ہے (امام سیوطیؒ نے دو جلدوں میں یہ احادیث جمع کی ہیں۔ اس سلسلے میں ملّا علی قاری اور علامہ طاہر فتنیؒ کی کتابیں بھی مشہور ہیں)

۵۔ علم النّاسخ والمنسوخ

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کون سی احادیث ناسخ ہیں اور کون سی منسوخ۔

۶۔ التوفیق بین الاحادیث

ان احادیث میں موافقت پیدا کرنا، جو بظاہر متعارض اور متضاد نظر آتی ہیں (تاویل مختلف الاحادیث از ابن قتیبہ، اختلاف الحدیث از امام شافعیؒ اس فن کی مشہور کتابیں ہیں)

۷۔ انساب الرواۃ

جس میں راویوں کے نسب درج کیے گئے ہیں (انساب الرجال الاحادیث اس سلسلے کی مشہور کتاب ہے)

۸۔ اسماء الصحابہ

صحابہ کے نام (امام بخاری کی ایک کتاب التاریخ الکبیر اور الاستیعاب ابن عبدالبر مالکی اس فن کی مشہور کتابیں ہیں)

۹۔ علم المختلف والمؤتلف

کئی راویوں کے نام آپس میں ملتے جلتے ہیں مثلاً حسین اور حصین ان ناموں کو اکٹھا کر کے ان کے حالات الگ الگ جمع کر دیے گئے ہیں (ابن حجرؒ کی ایک کتاب اس فن میں مشہور ہے)

۱۰۔ مشکلات الحدیث

جو احادیث معنی کے لحاظ سے مشکل معلوم ہوتی ہیں اور قرآن سے ٹکراتی معلوم ہوتی ہیں، ان کی تشریح کی گئی ہے (مثلاً مشکل الآثار امام طحاوی)

۱۱۔ فقہ الحدیث

حدیث سے مسائل کے استنباط کا طریقہ (مثلاً اعلام الموقعین از ابن قیمؒ اور حجۃ اللہ البالغہ از شاہ ولی اللہ دہلوی)

۱۲۔ علم اطراف الحدیث

آپ کو اگر حدیث کا ایک ٹکڑا معلوم ہو اور آپ کو اس کا حوالہ، سند در جہ متن درکار

ہے تو اس کے لیے بھی محدّثین نے انڈکس تیار کر دیے ہیں جن میں آپ آسانی سے وہ پوری حدیث تلاش کر سکتے ہیں۔ حافظ علی ابن عساکر نے چھٹی صدی ہجری میں "الاشراف علی معرفۃ الاطراف" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ سیوطی کی کتاب بھی اس سلسلے میں مشہور ہے۔ ایک کتاب مستشرقین نے بھی مرتب کی ہے جو مفتاح السنّۃ کے نام سے مصر میں شائع ہوئی ہے۔

۱۳۔ وفیات المحدّثین (محدّثین کے سنینِ وفات)

۱۴۔ احتجاج بالسُّنّۃ

جس میں اس بات پر بحث کی گئی ہے کہ دین میں سنّت کا کیا مقام ہے۔ اس فن میں امام سیوطیؒ کی مفتاح الجنّۃ۔ امام شافعیؒ کی کتاب الرسالہ اور کتاب الام کی ساتویں جلد، امام شاطبیؒ کی الموافقات جلد دوم اور امام ابنِ قیمؒ کی صواعق المرسلہ جلد دوم خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

یہ محدّثین کرام کی محنتوں کے چند نمونے ہیں۔ بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ دنیا میں آج تک کوئی قوم اپنے پیغمبر یا اپنے کسی راہنما کی زندگی کو محفوظ کرنے کا وہ اہتمام نہیں کر سکی جو صحابہ و تابعین نے حضورؐ کے اقوال و افعال کی حفاظت کے لیے کیا ہے۔ حضورؐ دنیا سے تشریف لے گئے لیکن جو شخص چاہے احادیث کا مطالعہ کر کے آج بھی آپ کے دیدارِ معنوی سے مشرف ہو کر سعادتِ دارین حاصل کر سکتا ہے۔ علامہ اقبال مرحوم نے خوب کہا۔

معنیِ دیدارِ آں آخر زماں!
حکمِ او بر خویشتن کردن رواں
در جہاں زی چوں رسولِ انس و جاں
تا چو او باشی قبولِ انس و جاں
باز خود را بیں ہمیں دیدارِ اوست
سنتِ او سرّے از اسرارِ اوست

فصل ۱۹

ختمِ نبوّت

حضور سرورِ کون و مکان صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا موضوع اس وقت تک تشنہ ہے جب تک یہ واضح نہ ہو جائے کہ حضور نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں اور آپ کے بعد کوئی نبی اور رسول نہیں آئے گا۔ یہ وہ اساس ہے جس نے نسل، رنگ اور وطن کے امتیازات کو ختم کر کے خدا اور رسول پر ایمان لانے والوں کو بھائی بھائی بنا دیا ہے۔ یہ عقیدہ اس امر کا اعلان ہے کہ خدا کی طرف سے انسانیت کو جو راہنمائی اور ہدایت ملتی تھی وہ مل چکی۔ جن عقائد و اعمال سے کفر لازم آتا ہے وہ بتائے جا چکے اور جن خصوصیات سے اہلِ ایمان کی پہچان ہوتی ہے ان کی صراحت اور وضاحت کر دی گئی ___ آپ کی تعلیمات کے علاوہ اب کسی نئی تعلیم پر ایمان لانا ضروری نہیں۔ اور نہ کسی فرد کے ماننے یا نہ ماننے پر کفر اور اسلام کا دار و مدار ہے۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ حضورؐ کے بعد بھی کسی نبی کے آنے کی گنجائش ہے، وہ دراصل ہمارے ملی استحکام پر ضربِ کاری لگاتا ہے۔ ہماری صفوں میں پراگندگی اور انتشار پیدا کرنا چاہتا ہے اور اس اساس کو ختم کرنے کے درپے ہے جس پر اسلام کا عالمگیر نظریۂ اخوت مبنی ہے۔

عقیدۂ ختم نبوت کی یہی وہ اہمیت ہے جس کے پیشِ نظر ہمارے دین میں اسے اتنا اونچا مقام دیا گیا ہے کہ اگر کوئی آدمی حضورؐ پر ایمان لائے، لیکن آپ کے آخری نبی ہونے کا قائل نہ ہو تو اسلامی معاشرہ میں اور خدا کے حضور۔ دونوں جگہ، اس کے ایمان اور اسلام کو لائقِ اعتنا، نہیں سمجھا جاتا۔ حضورؐ کی بعثت کو چودہ صدیاں ہو چلی ہیں۔ لیکن ہر دور اور دور کے ہر حصہ میں مسلمانوں نے ختمِ نبوت کو اپنے اعتقاد کی جان سمجھا ہے۔ ہمارے سلف تو اس معاملے میں اتنے سخت تھے کہ امامِ اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں جب ایک آدمی نے نبوت کا دعویٰ کیا تو حضرتِ امام نے فتویٰ دیا کہ یہی نہیں کہ مدعیِ نبوت پر ایمان لانے والا کافر ہے بلکہ جو شخص اس کاذب سے اس کے نبی ہونے کی دلیل طلب کرے گا وہ بھی کافر ہے۔

خدانخواستہ اگر اسلام دینِ کامل نہ ہوتا اور دنیا کے ہر حصّے میں ترقی پذیر معاشرہ کا ساتھ نہ دے سکتا تو کسی نئے نبی کی ضرورت سمجھ میں آسکتی تھی۔ لیکن جب حضورؐ پر دین کی تکمیل کردی گئی، جب پروردگار نے اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ کہہ کر دین کی تکمیل کا فیصلہ صادر کر دیا تو پھر بات ہی ختم ہو جاتی ہے۔ خود آنحضور نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے خاتم النبیین ہونے کی حقیقت بڑی وضاحت کے ساتھ بیان فرمائی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا۔

"میری اور انبیائے سابقین کی مثال ایک محل کی سی ہے جس میں ایک اینٹ کی جگہ خالی چھوڑ دی گئی ہو۔ لوگ اسے دیکھیں اور تعجب کریں کہ اس محل میں ایک اینٹ کی جگہ کیوں خالی چھوڑ دی گئی ہے؟ حضورؐ نے فرمایا کہ وہ اینٹ میں ہوں"

متعصب سے متعصب آدمی بھی اس بات کا اعتراف کرنے پر مجبور ہے کہ حضورؐ اپنی اُمّت پر بے حد شفیق تھے اتنے شفیق کہ ماں باپ کی شفقت بھی اس کے مقابلے میں ہیچ ہے۔ یہ اسی شفقت کا نتیجہ ہے کہ آپ نے فریضۂ رسالت سے متعلق کسی بات میں ابہام نہیں رہنے دیا۔ ایک ایک چیز کھول کھول کر بیان کی، راہ کے سارے پیچ و خم

بتائے، آنے والے فتنوں کی نشان دہی کی۔ قربِ قیامت کی نشانیوں کا ذکر کیا۔ غرضیکہ ہر ایسے معاملے پر روشنی ڈالی کہ جس سے آپ کی امّت کو آگے چل کر واسطہ پڑنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو منصب عظیم عطا فرمایا تھا۔ اس کے تقاضوں کی ادائیگی کے لیے آپ اتنے فکر مند رہتے تھے کہ جب تک حجۃ الوداع کے موقع پر اپنے ساتھیوں اور پیروکاروں سے یہ اعتراف نہیں کرا لیا کہ۔

"ہاں! آپ نے خدا کا پیغام پہنچا دیا ہے اور یہ فریضہ انجام دے دیا ہے۔"

اس وقت تک آپ کا اطمینان نہیں ہوا۔ غور کرنے کی بات ہے کہ جس پاک ہستی نے ماضی، حال اور مستقبل کے سبھی ضروری گوشے امّت پر اجاگر کر دیے۔ اگر آپ کے بعد کوئی نبی آنے والا ہوتا تو اس کی اطلاع دینے میں العیاذ باللہ وہ کوئی کوتاہی برت سکتی تھی؟ آپ سوچیں گے تو آپ کا ایمان گواہی دے گا کہ وہ لوگ جو آپ کے بعد بھی سلسلۂ نبوت کے اجراء کا امکان تسلیم کرتے ہیں۔ دراصل حضورؐ پر یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ آپ نے فرائضِ رسالت ادا نہیں کیے اور یہ وہ صورت ہے جسے کوئی مسلمان بقائمی ہوش و حواس قبول کرنے کے لیے نہیں ہو سکتا۔

قرآن اٹھا کر دیکھیے، کم سے کم سو آیات ایسی مل جائیں گی جن میں کہیں صراحتاً اور کہیں اشارۃً حضور کی خاتمیت کو بیان کیا گیا ہے، حدیث کو پڑھیے تو ایک سو سے زیادہ اسناد سے ختمِ نبوّت کی حدیثیں ہم تک پہنچی ہیں۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی شخص بعید از قیاس تاویلوں، لغو اور مہمل دلیلوں سے عقیدۂ ختمِ نبوّت سے انکار کرتا ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ امّت میں انتشار پیدا کر کے دشمنانِ اسلام کے ہاتھ مضبوط کرنا چاہتا ہے۔ انجیل نے خوب کہا۔

"جھوٹے نبیوں سے خبردار رہو جو تمہارے پاس بھیڑوں کے بھیس میں آتے ہیں مگر باطن میں پھاڑنے والے بھیڑیے ہیں۔ ان کے پھلوں سے تم انھیں پہچان لوگے کیا

جھاڑیوں سے انگور یا اونٹ کٹاروں سے انجیر توڑتے ہیں۔

(متی باب ۷، آیت ۱۵-۱۶)

عقیدۂ ختمِ نبوت کے مضمرات یوں تو بے شمار ہیں لیکن ایک دو باتیں ایسی ہیں جو ہر مسلمان کو اس کے فلسفہ اور پیغام کے طور پر دل و دماغ میں جذب کر لینی چاہئیں۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ آخری رسول آجانے کے بعد یہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی کہ جس رسول کا عہدِ رسالت دنیا کے اختتام تک کے لیے مقدر ہو چکا ہے اس کی امت کا منصبِ قیادت و امامت بھی قیامت تک کے لیے مسلّم ہے۔ رسول آخری رسول ہے تو امت، آخری امت، اب اس کے بعد کسی اور امت، کو برپا کرنے کی ضرورت باقی نہیں ہے۔ یہی اب دنیا کی تمام قوموں کو سیدھا راستہ دکھانے پر مامور ہے اور اسی کو زیب دیتا ہے کہ یہ "خاتمِ اقوام" ہونے کا تاجِ شرف و فضیلت سر پر رکھے۔ علامہ اقبال مرحوم نے مثنوی اسرارِ خودی میں اسی نظریۂ خاتمیت کو یوں بیان کیا ہے۔

پس خدا بر ما شریعت ختم کرد
بر رسولِ ما رسالت ختم کرد
رونق از ما محفلِ ایّام را
او رُسل را ختم و ما اقوام را
خدمتِ ساقی گری بر ما گزاشت
داد ما را آخریں جامے کہ داشت
"لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ" ز احسانِ خدا است
پردۂ ناموسِ دینِ مصطفےٰ است
قوم را سرمایۂ قوت ازو
حفظ سرِّ وحدتِ ملّت ازو

حق تعالیٰ نقشِ ہر دعویٰ شکست

تا ابد اسلام را شیرازہ بست

دل ز غیر اللہ مسلمان بر کند

نعرۂ لاقوم بعدی می زند

خدا نے ہمارے رسولؐ پر رسالت اور ہم پر شریعت ختم کردی، اب بزمِ کائنات کی رونق ہم سے ہے۔ ہمارے رسول، انبیاء و مرسلین کے خاتم ہیں تو ہم اقوام کے۔ ساقی گری کی خدمت ہمیں تفویض کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں شرابِ معرفت کا آخری جام عطا کردیا ہے۔ حضورؐ کا یہ ارشاد کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ خدا کے احسانات میں سے ایک عظیم احسان ہے اور دیکھا جائے تو یہ دینِ مصطفےٰؐ کے ناموس کا محافظ ہے۔ اسی ارشاد میں وحدتِ ملّت کی حفاظت کا راز مضمر ہے اور مسلمان قوم کی طاقت کا اصل سرمایہ یہی عقیدۂ ختمِ نبوت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ابد تک اسلام کی شیرازہ بندی کردی ہے ہر دعوے کا نقش باطل کردیا ہے۔ اسی عقیدہ کے تحت مسلمان ماسوا اللہ سے اپنا تعلق توڑ لیتا ہے اور امّتِ مسلمہ کے بعد کوئی امّت نہیں" کا نعرہ بلند کرتا ہے۔"

تیسرا باب

آخرت

تو ازاں روزے کہ در ہست آمدی

آتشے یا خاک یا بادے بُدی

گر بداں حالت ترا بُودے بقا

کہ رسیدے مر ترا ایں ارتقا

از مبدّل ہستئ اول نماند

ہستئ دیگر بجائے او نشاند

ایں بقاہا از فناہا یافتی

از فنائش رُو چرا بر تافتی

(مولانائے روم)

فصل ۱

عقیدۂ آخرت

ایک خدا اور اس کی جملہ صفات پر ایمان لانے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ خدا کوئی اندھی بہری طاقت نہیں بلکہ وہ جملہ صفات سے متصف ہے۔ وہ منصف و عادل بھی ہے اور حکیم و حاکم بھی۔ رحیم و کریم بھی ہے اور قہار و جبار بھی۔ یہ اور دوسری ساری صفتیں وہ ہیں جن کے مظاہر کائنات کے گوشے گوشے میں نظر آتے ہیں۔ غور کیا جائے تو عقیدۂ آخرت ان صفات کا ایک بدیہی اور منطقی نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔

اگر خدا عادل ہے تو عقل تقاضا کرتی ہے کہ وہ اپنے فرمانبرداروں کو انعام واکرام سے نوازے اور جو اس کے منکر و نافرمان ہیں انھیں سزا دے، ہر شخص کو ٹھیک ٹھیک اس کے اعمال وافعال کا بدلہ ملے۔ نیک کامیاب ہوں اور بدناکام۔ لیکن عملاً آپ دیکھیے کیا ہو رہا ہے۔ یہاں بالعموم راحت و آرام کی زندگی وہ گزار رہے ہیں جو خدا نام کی کسی چیز کو جانتے تک نہیں۔ وہ روپے پیسے سے کھیلتے ہیں اور کاروں اور ہوائی جہازوں میں سفر کرتے ہیں مگر وہ لوگ جو موحد ہیں اور احکام خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں عموماً غربت و افلاس اور معاشی بدحالی کے شکار نظر آتے ہیں۔ اگر دنیا اسی

حال ہیں ختم ہو جائے تو خدا کی صفتِ عدل کوئی معنی نہیں رکھتی۔

اسی طرح ہم نے مانا کہ خدا حکیم ہے اور اس کا کوئی کام حکمت و مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔ لیکن فرض کر لیجیے اگر دنیا کی یہ محفل یوں ہی اُجڑ جائے اور کارخانۂ حیات بس بے مقصد ہی درہم برہم ہو جائے۔ انسانی کردار کائناتِ ارضی کی سٹیج پر ایک ڈرامہ دکھا کر چھلاوے کی طرح غائب ہو جائیں تو کون ہے جو خالقِ کائنات کو حکیم مانے گا؟ سوچا جائے تو اس صفتِ حکمت کا آپ سے آپ مطلب ہی یہ ہے کہ یہ دنیا بے مقصد ختم نہ کر دی جائے بلکہ اس کا انجام بھی غایت درجہ حکیمانہ ہو۔

ہم نے تسلیم کیا کہ خدا رحیم و کریم ہے، اتنا رحیم و کریم کہ اس کے رحم و کرم کا اندازہ ہی نہیں لگایا جا سکتا۔ پھر کیا یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اس دنیا میں جو لوگ ستائے جا رہے ہیں، وہ ان کے سروں پر دستِ شفقت نہ رکھے اور مظلوموں کی دادرسی نہ کرے؟ غور کرنے کی بات ہے اس کا نام لینے پر کتنوں کو انگاروں پر لٹایا گیا۔ کتنے بے گھر ہو گئے کتنے تھے جنھیں آروں سے چیر ڈالا گیا؟ پھر ــــ کون یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ وہ اپنے ان چاہنے والوں پر داد و دہش کی بارش نہیں کرے گا اور انھیں حیاتِ جاودانی کی لذتوں سے خورسند نہیں بنائے گا ــــ؟ اگر ایسا نہ ہو تو اس کی صفتِ رحمت پر حرف آتا ہے اور یہ وہ قیاس ہے جسے قبول کرنے کے لیے کوئی موحّد تیار نہیں ہو سکتا۔

عقیدۂ توحید بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ "احکم الحاکمین" ہے، اور اس کی بالادستی سب پر قائم ہے پھر کیا یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ اس حاکمِ حقیقی کی کوئی عدالت نہیں ہوگی، اور مجرموں اور باغیوں کو سزا نہیں دے گا۔ جب دنیا کے چھوٹے چھوٹے حاکموں کے متعلّق بھی ہم یہ تصوّر نہیں کر سکتے تو اس سب سے بڑے حکمران کے متعلق یہ کس طرح باور کیا جا سکتا ہے؟

اسی طرح آپ اللہ تعالیٰ کی دوسری صفات سامنے رکھیں تو آپ کا دل گواہی دے گا کہ ایک ایسا جہان ہونا چاہیے جس میں دنیا کی ان بے اعتدالیوں کا ازالہ ہو سکے اور اللہ تعالیٰ کی صفات کے تقاضے پورے ہوں ۔۔۔ عقلِ سلیم کی روشنی میں جب بھی سوچا گیا ہے یہی نتیجہ سامنے آیا ہے۔ خاندانِ قریش کے مشہور سیاست دان اور زیرک رہنما حضرت عمروؓ بن العاص دعوتِ اسلام سے چڑ کر حبشہ چلے آئے تھے۔ روایت ہے کہ قریش کا ایک نوجوان ان کے پاس آیا اور کہا۔ "اے ابوعبداللہ! قوم کا خیال ہے کہ تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف مائل ہو گئے ہو!" حضرت عمروؓ بن العاص نے اسے ایک متعین مقام پر ملنے کا وقت دیا اور جب یہ دونوں ملے تو ابن العاص نے اس نوجوان سے پوچھا۔

"میں تمہیں خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ ہم ہدایت پر ہیں یا ایرانی اور رومی؟" نوجوان نے ایک لمحہ سوچے بغیر جواب دیا "ہم"۔ حضرت عمروؓ بن العاص نے مسکت لہجے میں کہا "پھر یہ راست روی کی فضیلت ہمارے کس کام کی؟ جب مادی اعتبار سے وہ ہمارے مقابلے میں کہیں زیادہ صاحبِ اقتدار ہیں ۔۔۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ دوسری زندگی کے متعلق محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جو کچھ کہتے ہیں وہ سچ ہے، واقعی آخرت ہی میں نیکی کا بدلہ نیکی اور برائی کا بدلہ برائی سے دیا جائے گا"[1]

دیکھا آپ نے! دنیا میں راست روی کا نتیجہ اگر مادی اعتبار سے وہی ہو جو ہماری نظروں کے سامنے ہے تو کون کہہ سکتا ہے کہ خدا رحیم ہے، حضرت عمروؓ بن العاص نے خدا کی قسم دے کر اپنے ساتھی سے اسی لیے سوال کیا تھا، تاکہ ایمان باللہ کی روشنی میں

---

[1] بحوالہ عمر فاروقِ اعظم از محمد حسین ہیکل۔

ایمان بالآخرت پر استدلال کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے اسلام نے عقیدۂ آخرت کو توحید کی ایک فرع اور شاخ قرار دیا ہے۔ اگر آپ توحید پر ٹھیک ٹھیک ایمان لے آتے ہیں تو آپ کا ایمان لازماً عقیدۂ آخرت کی طرف آپ کی رہنمائی کرے گا اور اگر آخرت کے متعلق آپ کو شبہات لاحق ہیں تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ آپ توحید کی حقیقت اور اصلیت سے بالکل بے خبر ہیں۔

قرآنِ حکیم نے اسی لیے آخرت پر اعتراض کرنے والوں کو خدا کا منکر قرار دیا ہے۔ فرمایا۔

وَاِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ۔	اب اگر تمھیں تعجب کرنا ہے تو تعجب کے قابل لوگوں کا یہ قول ہے کہ جب ہم مر کر مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہم نئے سرے سے پیدا کیے جائیں گے؟ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب سے کفر کیا ہے۔

اسی آیت میں آگے چل کر کہا۔

وَاُولٰٓئِكَ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (رعد۔ ۵)	اور یہی ہیں جن کی گردنوں میں طوق ہوں گے اور یہ جہنمی ہیں اور جہنم ہی میں ہمیشہ رہیں گے۔

فصل ۲

عقیدۂ آخرت کی اہمیّت

کہا جا سکتا ہے کہ آخرت کے ہونے نہ ہونے کا مسئلہ ایک مابعد الطبیعاتی مسئلہ ہے اور اسے توحید اور رسالت کی طرح ایمان و اسلام کی بنیاد قرار دینا صحیح نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ وہ سچائی ہے جسے جھٹلانے سے دین و مذہب کا سارا نظام باطل ہو جاتا ہے، مذہب کا اصل الاصول یہ ہے کہ انسان نیک بن جائے اور خالق کے احکام کی اطاعت کرے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان کے اندر کی "انسانی جبلّت" اس کے لیے ایک محرک بھی ثابت ہوتی ہے مگر یہ محرک اتنا کمزور ہے کہ بسا اوقات انسان کی حیوانی خصلت اس پر غالب آجاتی ہے، شہرت، ذاتی منفعت اور اس طرح کے چند دوسرے عارضی اور ناپائیدار عوامل جہاں غالب ہوئے آدمی غلط کاری پر اتر آتا ہے، آپ خود سوچیے اگر ایک شخص کا عقیدہ یہ ہو کہ دنیا کے بعد کوئی اور عالم نہیں اور ہم سے کوئی بالادست طاقت زندگی کا احتساب نہیں کرے گی تو اسے کیا پڑی ہے کہ وہ گلچھرے نہ اڑائے، رشوت نہ لے اور زنا نہ کرے، بدی کے

دلفریب اور بظاہر پرکشش رستے کو چھوڑ کر وہ نیکی کے خارزار میں کیوں اُلجھے ــــــ جہاں قدم قدم پہ پابندیاں ہیں اور جس کا ایک ایک موڑ زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے۔

یہ قدم قدم بلائیں، یہ سوادِ کوئے جاناں
وہ یہیں سے لوٹ جائے جسے زندگی ہو پیاری

آپ کہیں گے انسانی رہنمائی کے لیے ضمیر جو موجود ہے مگر کبھی آپ نے سوچا۔ ضمیر ہے کیا چیز ــــــ ؟ یہ کوئی مستقل اور نہ تبدیل ہونے والی چیز نہیں ہو سکتا ہے کہ میرا ضمیر مجھے جس بات پر ملامت کرتا ہے آپ کا ضمیر اس بات پر آپ کو نہ ٹوکے۔ اسی طرح ایک ہندو کا ضمیر جن باتوں میں آڑے آتا ہو گا ممکن ہے ایک مسلمان انھیں قابلِ اعتراض نہ سمجھے، ایک موحّد اور دہریے کا ضمیر بھی آپس میں زمین آسمان کا اختلاف رکھتا ہے کیوں؟ اس لیے کہ ضمیر دراصل انسانی عقائد و نظریات اور مخصوص تربیت کے مطابق کام کرتا ہے۔ جب ضمیر کی اصلیت یہ ہو تو کون دعویٰ کر سکتا ہے کہ یہ نیکی پر اُبھارنے کے لیے کافی ہے۔

پس خود کو سنوارنے اور نیکی کی راہ پر گامزن ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ہم آخرت پر ایمان لائیں اور یہ یقین پیدا کریں کہ مرنے کے بعد ہم سے ایک ایک لمحہ کا حساب لیا جائے گا۔ یہی وہ یقین ہے جو کھلے اور چھپے ہمیں گناہوں سے بچاتا ہے اور صحیح خطوط پر ضمیر کی تربیت کر کے اسے نیکی کا ایک ذمہ دار نمائندہ بنا دیتا ہے

فصل ۳

اشکالات
کا
بنیادی
حل

توحید کی طرح عقلِ حیلہ ساز عقیدۂ آخرت کے بارے میں بھی کچھ سوالات اٹھاتی ہے ـــــ اور سوالات کس چیز کے بارے میں نہیں اٹھائے جا سکتے ـــــ مگر یہاں بھی بات فقط اتنی ہے جس کا مذکور پہلے ہو چکا کہ عقائدِ اسلام کو عقل کے خلاف تو کوئی نہیں ٹھہرا سکتا۔ البتہ اتنا کہا جا سکتا ہے کہ عقل ان میں سے بعض کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ صرف اتنی سی بات پر اگر ہم حقائق کا انکار کرنے بیٹھ جائیں تو ہم سے بڑھ کر کم عقل اور کم سواد کون ہوگا۔ "کنوئیں کا مینڈک" اگر یہ سمجھنے لگ جائے کہ دنیا جو کچھ ہے وہ کنوئیں کے اندر ہے اس لیے کہ باہر کی دنیا اس نے دیکھی نہیں تو کون اس کی بات کو تسلیم کرے گا؟ یا ایک بچہ اگر ماں کے پیٹ میں صرف "بطنِ مادر" ہی کو ساری کائنات جان کر اس کے باہر کے جہان کا انکار کر دے تو کون صاحبِ عقل اس کو باور کرے گا؟ یہ دلیل تو اس کے پاس بھی ہے کہ ماں کے پیٹ کے علاوہ کسی دوسری دنیا کا وجود عقل میں نہیں آتا ـــــ مولانا رومؒ نے اسی "عقل پرستی" پر تنقید کرتے ہوئے کہا اور خوب کہا:

اے کہ اندر چشمۂ شور است جات

تو چہ دانی شطّ و جیحون و فرات

اے وہ کہ چشمۂ شور تیرا مقام ہے تو کیا جانے کہ یہاں جیحون و فرات جیسے دریا بھی موجزن ہیں۔

ایک اور جگہ کہا۔

چوں آں کرمے کہ در سنگے نہاں است

زمین و آسمانِ او ہماں است

پتھر میں رہنے والا کیڑا اگر یہ سمجھے کہ زمین و آسمان جو کچھ ہیں بس اسی پتھر کے اندر ہیں تو اسے مطعون نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ غریب بھی عقل کی روشنی میں اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ جو کچھ نظر نہیں آتا اور جو عقل کی دسترس سے باہر ہے اسے میں کیسے مانوں؟ کہیے آپ کا کیا فیصلہ ہے؟ آپ عقل ہی کو سب کچھ مانیں گے یا ضمیر و وجدان، آثارِ کائنات، اور انبیاء کی شہادت کو بھی درخورِ اعتنا سمجھیں گے؟ — دیکھیے! قرآن نے منکرینِ آخرت کے متعلق کتنی سچی بات کہی۔

بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ ۚ	نہیں یہ بات نہیں ہے اصل حقیقت یہ ہے کہ جس بات پر یہ اپنے علم سے احاطہ نہ کر سکے، اور جس بات کا نتیجہ ابھی پیش نہیں آیا، اس کے جھٹلانے پر آمادہ ہو گئے۔
(سورہ یونس - آیت ۳۹)	

فصل ۴

سائنس
اور
عقیدۂ
آخرت

ہر شخص یہ اعتراف کرے گا کہ عصرِ حاضر میں عقلِ انسانی کی عظمت کا جو بھرپور مظاہرہ سائنس کی شکل میں ہوا ہے وہ انسانیت کی پوری تاریخ میں لاجواب و بے مثال ہے یہی وجہ ہے کہ بعض ظاہر پرست لوگ بات بات پر سائنس دانوں کے افکار و نظریات کا حوالہ دیتے ہیں اور اس طرح انکارِ خدا اور انکارِ آخرت کے لیے ذہنی سہارے تلاش کرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ خود سائنس دان اور مغرب کے ممتاز مفکرین اس بات کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ آخرت ۔ وحی، اور اس طرح کے دوسرے حقائق سائنس کے حدودِ ادراک سے خارج ہیں یہی نہیں بلکہ عقل کو خدا سمجھنے والے یورپ میں اب اہلِ علم کھلم کھلا دنیا کی مکمل تباہی پر ایمان لا رہے ہیں۔ جوہری بم کی ایجاد ایک عظیم الشان ایجاد سہی مگر برٹنڈرسل نے اسی کے اندر دنیا کی مکمل تباہی دیکھ لی تھی۔ انھوں نے ۱۹۴۸ء کے موسم سرما میں بی بی سی ریڈیو سے تقریر نشر کرتے ہوئے کہا تھا۔

"اگر جوہری بم زیادہ تعداد میں پھینکے گئے ـــ اور عظیم جنگوں کا سلسلہ جاری رہا تو ظاہر ہے کہ پھینکے جائیں گے ـــ تو بعض ماہرین طبیعیات کا خیال یہ ہے

(اور ان کی رائے واجب لحاظ و احترام ہے) کہ یہ بم تابکار پیدا کردیں گے جو ہوا سے گھل مل کر اڑتے اور اِدھر سے اُدھر گزرتے ہوئے زندگی کی ہر صورت کو ختم کردیں گے اور چند سال بعد ہماری زمین انسانوں، جانوروں اور پودوں سے بالکل محروم اور خالی ہوجائے گی۔[1]

انہی برٹینڈرسل نے "مذہب اور سائنس" میں ایک قدم اور آگے بڑھایا اور لکھا کہ۔

وہی قوانین جو ترقی کا باعث ہوتے ہیں۔ تنزل کا سبب بھی بن جاتے ہیں۔ ایک دن سورج سرد پڑ جائے گا اور زندگی ختم ہوجائے گی۔ زمین پر حیوانی اور نباتی زندگی کی پوری تاریخ بہت گرم اور بہت سرد زمانوں کے بیچ کا ایک وقفہ ہے مسلسل ارتقاء کوئی کلیہ نہیں۔ بلکہ تنزل اور ترقی کا پنڈولم ادھر ادھر حرکت کر رہا ہے جس میں بلاشبہ کائناتی قوتوں کے انتشار کی وجہ سے نیچے کی طرف ایک خفیف سا رجحان پایا جاتا ہے۔"

لوگ شاید تنہا برٹینڈرسل کے کہنے پر "سائنس کے محدود دائرہ کا نظریہ" تسلیم نہ کرتے۔ اس لیے "مذہب اور سائنس" ہی میں برٹینڈرسل نے متعدد دوسرے اہلِ علم کو اپنے افکار پر گواہ بنایا۔ ان خیالات کا مطالعہ کیجیے اور پھر بتائیے کہ کیا سائنس کو عقیدۂ آخرت کا نقیض ٹھہرانا صحیح ہے۔

سر آرتھر تھامس کہتے ہیں۔

"سائنس، سائنس ہونے کی حیثیت میں "کیوں" کا سوال کبھی نہیں اٹھاتی، وہ تخلیق سے پہلے اور اس کے بعد کی غرض و غایت کے بارے میں کبھی تجسس نہیں کرتی ـــ سائنس حقیقت کا نقطۂ آغاز یا اس کا سنگِ بنیاد ہونے کا دعوٰی کبھی نہیں کرتی۔ سائنس ماورائے محسوسات اور روحانی مسائل میں "اپنے طریقے" استعمال کرنے سے عاجز ہے۔

ڈاکٹر بینوسکی کا کہنا ہے۔

---

[1] بحوالہ علم کے نئے افق از سی ایم جوڈ صفحہ ۹۲

"وحی اور الہام ایک ایسا تجربہ ہے جو اصولی حیثیت سے سائنس کے حدودِ عمل سے پرے ہے"

سر آرتھر تھامپسن مزید لکھتے ہیں۔

"سائنس 'کیوں' کا جواب نہیں دے سکتی، البتہ مذہب اس کا جواب دے سکتا ہے کہ ستارے کیوں بنے؟ سورج سے سیارے کیوں پھوٹے؟ یا زمین کیوں پیدا ہوئی اور اس سے آخر کار زندگی کیوں وجود میں آئی"

پروفیسر جے۔ ایس ہالڈین کی تحقیق ہے کہ۔

ہم اپنے داخل کے سچے عملی تصورات، حق، ایثار، جمال اور ان سے حاصل شدہ برادرانہ تعلقات کے اصولوں میں خدا کا جلوہ پا سکتے ہیں۔

برٹینڈرسل نے یہ اور اس طرح کے دوسرے متعدد حوالے نقل کرنے کے بعد سائنس کی "نارسائی" کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے۔

سائنس اقدار کے متعلق کچھ نہیں کر سکتی اور ایسے مسائل مثلاً "محبت نفرت سے بہتر ہے" اور "رحم ظلم سے افضل ہے"۔ کے متعلق کوئی رائے نہیں دے سکتی"

ہو سکتا ہے آپ کہیں کہ سائنس اگر آخرت اور دوسرے مابعد الطبیعیاتی عقائد کا انکار نہیں کرتی تو ان کا امکان بھی تو تسلیم نہیں کرتی — آئیے اس سلسلے میں ایک اقتباس اور پڑھ لیجیے۔ برطانیہ کے مشہور سائنس دان مسٹر ہوئل نے کوہ پالومر (کیلیفورنیا) کی ۲۰۰ انچ دہانے والی دوربین سے کائنات کا مشاہدہ کیا۔ ان کے انکشافات ۲۰ ستمبر کے "مارننگ نیوز" ڈھاکہ میں شائع ہوئے ہیں۔ مسٹر ہوئل کائنات کی بوقلمونیاں دیکھنے کے بعد بے اختیار پکار اٹھے۔

"اس کائنات میں ہر چیز ممکن ہے یعنی روحانیت اگر کوئی چیز ہے تو کائنات میں اس کے لیے گنجائش ہے اور اگر جنت و دوزخ کوئی چیز ہے تو کائنات میں ان کے لیے بھی گنجائش ہے۔"

فصل ۵

خسارے میں کون ہے؟

جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، ان کا قیاس یہ ہے کہ دنیا ایک دن بہر حال تباہ و برباد ہو جائے گی اور اس کے بعد اس کرۂ ارض پر زندگی کا نام و نشان باقی نہیں رہے گا۔ "قیاس" کا لفظ ہم نے اس لیے استعمال کیا ہے کہ وہ اپنے اس نظریہ کے ثبوت میں کسی عینی مشاہدے کی دلیل نہیں رکھتے یہ محض ان کا ظن ہے کہ دنیا کے خاتمے پر کسی دوسرے عالم کا ظہور نہیں ہوگا اور ظن کے لیے ضروری نہیں کہ وہ صحیح نکلے۔ فرض کیجیے، آخرت کو جھٹلانے والا گروہ اس چند روزہ زندگی میں اسلامی احکام کو پسِ پشت ڈال دیتا ہے اور مرنے کے بعد اس کے نظریہ کے مطابق اس سے کوئی محاسبہ نہیں کیا جاتا، تو اسے بجز اس بات کے کوئی فائدہ نہ ہوگا کہ وہ دنیائے فانی میں جی بھر کر بے اعتدالیاں کر چکا ہے اور یہاں اس نے خوب آزادی کے دن گزارے ہیں لیکن اگر اس گروہ کا ظن بے بنیاد ثابت ہوا۔ جیسا کہ دنیا کی عظیم ترین اکثریت ہر دور میں مانتی چلی آئی ہے تو اندازہ کیجیے کہ چند دن کی عارضی لذت کے لیے اسے جو عذاب بھگتنا پڑے گا وہ اس

آزادی و بے راہ روی کے عوض اسے کتنا مہنگا پڑے گا؟ جو لوگ انبیائے صادقین کی اطلاع پر یقین بلکہ عین الیقین رکھتے ہیں ان سے بحث نہیں کہ وہ اپنی پختگیٔ ایمان کے لیے کسی دلیل کی حاجت نہیں رکھتے۔ سوال تو ان کم سوادوں سے ہے جو ماورائے عقل امور میں بھی عقل سے فیصلہ کرانے کے خواہش مند ہیں انھیں سوچنا چاہیے کہ اس عظیم ترین "خطرے" کے باوجود وہ اپنے ظن اور قیاس پر کیوں اڑے ہوئے ہیں — ہم اپنی صحت خراب ہونے کے خطرہ سے بچنے کے لیے — کیا کیا پابندیاں عاید نہیں کر لیتے۔ پھر کیا آخرت کے یومِ حساب کا خطرہ — صحت بگڑنے سے بھی کم تر درجہ رکھتا ہے کہ اسے یکسر نظر انداز کر دیا جائے۔

کوئی یہ نہ سمجھے کہ العیاذ باللہ ہم آخرت پر یقین نہیں رکھتے۔ اس بنیادی سچائی میں شک لاحق ہونے کے وسوسہ شیطانی سے ہزار بار پناہ! مقصود صرف اتنا ہے کہ عقل ہی کو سب کچھ ماننے والے یقین کی راہ سے تو بات نہیں سمجھیں گے۔ چلیے سُود و زیاں کے نقطۂ نظر ہی سے اس معاملہ پر غور کر لیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے بھی ایک منکرِ خدا سے مناظرہ کرتے ہوئے یہی بات فرمائی تھی۔ آپ نے ایک ملحد کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر ایسا ہی ہے جیسا کہ تو کہتا ہے (یعنی خدا نہیں ہے) تو میں بھی بچ گیا تو بھی بچ گیا اور اگر ایسا ہے جیسا کہ میں کہتا ہوں (یعنی ذاتِ باری کا وجود ہے) تو میں بچ گیا اور تو پھنس گیا اور ہمیشہ کے عذاب میں مبتلا ہو گیا۔

کیمیائے سعادت میں امام غزالیؒ نے اس قول کی خوب تشریح کی ہے۔ حضرت امامؒ لکھتے ہیں۔

"اور یہ بات جو امیر المومنین حضرت علیؓ نے فرمائی اس وجہ سے نہ تھی کہ آپ کو جنابِ باری کی ذات میں شک تھا بلکہ ایسا کہنا اس ملحد کی عقل کے مطابق تھا کیونکہ آپ نے سمجھ لیا تھا کہ راہِ یقین اس ملحد کی سمجھ میں نہیں آسکتی۔ پس اس سے

سمجھ لے کہ جو کوئی دنیا میں زادِ آخرت کے سوا دوسری چیزوں میں مشغول ہے وہ بے وقوف ہے اور اس کی غفلت کا سبب اور امورِ عاقبت میں غور نہ کرنے کی وجہ خواہشاتِ دنیا کا غلبہ ہے جو اسے غور کرنے کی مہلت نہیں دیتا اور وہ جو عذابِ آخرت پر یقین رکھتا ہے اور وہ جو ظنِ غالب رکھتا ہے اور وہ جو گمانِ ضعیف رکھتا ہے۔ عقل کی رو سے سب پر واجب ہے کہ اس خطرۂ عظیم سے بچیں اور احتیاط و امن کا راستہ اختیار کریں۔[1]

---

[1] کیمیائے سعادت باب چہارم معرفتِ آخرت

فصل ٦

آخرت کے چند مناظر۔ قرآن میں

عدالتِ آخرت میں مجرموں کی حاضری

"ڈراؤ انھیں اس دن سے جب کہ زمین اور آسمان بدل کر کچھ سے کچھ کر دیے جائیں گے اور سب کے سب اللہ واحد قہار کے سامنے بے نقاب حاضر ہو جائیں گے اس روز تم مجرموں کو دیکھو گے کہ زنجیروں میں ہاتھ پاؤں جکڑے ہوں گے۔ تارکول کے لباس پہنے ہوئے ہوں گے اور آگ کے شعلے ان کے چہروں پر چھائے جا رہے ہوں گے۔" (سورہ ابراہیم آیت ۴۸-۴۹-۵۰)

گواہ پیش ہوں گے

"آج ہم ان کے منہ پر مہر لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ ہم سے (ان کے کرتوت) بیان کریں گے، اور جو کمائی وہ کرتے تھے ان کے پاؤں اس کی گواہی دیں گے۔" (سورہ یٰسین)

○

"ان پر گواہی دیں گے ان کے کان، ان کی آنکھیں اور ان کی کھالیں کہ وہ کیا کچھ کرتے تھے وہ اپنی کھالوں سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی؟"

وہ جواب دیں گی اس خدا نے ہم کو بھی گویائی دی جس نے ہر چیز کو گویائی دی ہے۔" (حٰم سجدہ ع ۲)

فدیہ دے کر نہیں چھوٹا جا سکے گا!

اگر کسی شخص کے پاس جس نے ظلم کیا ہے۔ روئے زمین کی دولت بھی ہو تو اس عذاب سے بچنے کے لیے وہ اسے فدیہ میں دینے پر آمادہ ہو جائے گا۔ جب یہ لوگ اس عذاب کو دیکھ لیں گے تو دل ہی دل میں پچھتائیں گے مگر ان کے درمیان پورے انصاف سے فیصلہ کیا جائے گا۔ کوئی ظلم ان پر نہ ہوگا۔" (سورہ یونس آیت ۵۵)

دولت اور دوستیوں کا سہارا

"اے نبی میرے جو بندے ایمان لائے ہیں ان سے کہہ دو کہ نماز قائم کریں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے کھلے اور چھپے راہ خرچ کریں۔ قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس میں نہ خرید و فروخت ہو گی اور نہ دوست نوازی ہو سکے گی۔"

(سورۂ ابراہیم آیت ۳۱)

پیشواؤں کا اظہارِ عجز و بے بسی

"اور یہ لوگ جب اکٹھے اللہ کے سامنے بے نقاب ہوں گے تو اس وقت ان میں سے جو دنیا میں کمزور تھے وہ ان لوگوں سے جو بڑے بنے ہوئے تھے کہیں گے دنیا میں ہم تمہارے تابع تھے اب کیا تم اللہ کے عذاب سے ہم کو بچانے کے لیے بھی کچھ کر سکتے ہو؟ وہ جواب دیں گے اگر اللہ نے ہمیں نجات کی کوئی راہ دکھائی ہوتی تو ہم ضرور تمہیں بھی دکھا دیتے اب تو یکساں ہے خواہ ہم جزع فزع کریں

یا صبر، بہر حال ہمارے بچنے کی کوئی صورت نہیں" (سورۂ ابراہیم آیت ۲۱)

"اور جب، وہ لوگ جنھوں نے دنیا میں شرک کیا تھا اپنے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کو دیکھیں گے تو کہیں گے "اے پروردگار! یہی ہیں ہمارے وہ شریک جنھیں ہم تجھے چھوڑ کر پکارا کرتے تھے" اس پر ان کے وہ معبود انھیں صاف جواب دیں گے کہ تم جھوٹے ہو" (سورہ النحل آیت ۸۶)

مریدوں کی حسرت

"جب پیشوا اپنے پیروں سے اظہارِ بیزاری کریں گے، اور (دونوں) خدا کا عذاب دیکھ لیں گے اور ان کے تعلقات منقطع ہو جائیں گے اور جنھوں نے پیروی کی ہوگی وہ (حسرت سے) کہیں گے کہ کہیں ایسا ہوتا کہ ہمیں دوبارہ دنیا میں جانا نصیب ہوتا تو ہم بھی ان سے اسی طرح اظہارِ بیزاری کرتے، جس طرح انھوں نے ہم سے بیزاری ظاہر کی ہے۔" (البقرہ ع-۱۹)

مجرموں کی پشیمانی

واقعی ہمارے رب کے رسول حق لے کر آئے تھے۔ پھر کیا اب ہمیں کچھ سفارشی ملیں گے جو ہمارے حق میں سفارش کریں۔ یا ہمیں دوبارہ (دنیا میں) واپس ہی بھیج دیا جائے تاکہ ہم جو کچھ پہلے کرتے تھے اس کے بجائے اب دوسرے طریقے پر (خدا کے حکم کے مطابق) کام کریں۔"

(سورۂ الاعراف ع-۶)

انجام

"جن لوگوں نے بھلائی کا طریقہ اختیار کیا۔ ان کے لیے بھلائی ہے اور مزید فضل۔ ان کے چہروں پر روسیاہی اور ذلّت نہ چھائے گی۔ وہ جنت کے مستحق ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے اور جن لوگوں نے برائیاں کمائیں، ان کی برائی جیسی ہے ویسا ہی وہ بدلہ پائیں گے۔ ذلّت ان پر مسلط ہو گی۔ کوئی اللہ سے ان کو بچانے والا نہ ہو گا۔ ان کے چہروں پر ایسی تاریکی چھائی ہوئی ہو گی جیسے رات کے سیاہ پردے ان پر پڑے ہوئے ہوں۔ وہ دوزخ کے مستحق ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے"

(سورۂ یونس۔ آیت ۲۶۔۲۷)

فصل ۷

آخرت کے چند مناظر — حدیث میں

تین گروہ

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن سب آدمی تین قسموں اور تین گروہوں میں اٹھائے جائیں گے۔ ایک قسم پیدل چلنے والے، ایک قسم سوار اور ایک قسم منہ کے بل چلنے والے۔ عرض کیا گیا "یا رسول اللہ یہ (تیسرے گروہ والے) منہ کے بل کس طرح چل سکیں گے"؟ آپ نے فرمایا "جس نے انھیں پاؤں کے بل چلایا ہے، وہ اس پر بھی قدرت رکھتا ہے کہ انھیں منہ کے بل چلائے"۔ معلوم ہونا چاہیے کہ یہ لوگ اپنے منہ کے ذریعے ہی زمین کے ہر ٹیلے اور ہر کانٹے سے بچیں گے (ترمذی)

سب سے ہلکا عذاب

نعمان بن بشیر سے روایت ہے، کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ دوزخیوں میں سب سے ہلکے عذاب والا وہ شخص ہوگا، جس کی چپلیں اور ان چپلوں کے تسمے آگ کے ہوں گے، ان کی گرمی سے اس کا دماغ اس طرح کھولے گا، اور جوش مارے گا کہ جس طرح چولہے پر دیگچی کھولتی ہے اور اس میں جوش آتا ہے وہ نہیں خیال کرے گا کہ کوئی شخص اس سے زیادہ سخت عذاب میں بھی ہے حالانکہ وہ دوزخیوں میں سب سے ہلکے عذاب والا ہوگا (بخاری و مسلم)

جہنّمیوں کی غذا

حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ "غساق" (یعنی وہ سڑی ہوئی پیپ جو جہنمیوں کے زخموں سے نکلے گی اور جس کے متعلق قرآن مجید میں تبلایا گیا ہے کہ وہی انتہائی بھوک میں ان کی غذا ہوگی وہ اس قدر بدبودار ہوگی کہ اگر اس) کا ایک ڈول اس دنیا میں بہا دیا جائے تو ساری دنیا (اس کی سڑاند سے) بدبودار ہو جائے۔ (ترمذی)

اور جنّت !!

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے وہ چیزیں تیار کی ہیں جن کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہے نہ کسی کان نے سنا ہے، اور نہ کسی بشر کے دل میں کبھی ان کا خطرہ یا خیال ہی گزرا ہے (بخاری و مسلم)

قرآن و حدیث کی بیان کردہ ان چند تفصیلات کا مطالعہ کیجیے اور پھر سوچیے کہ آیندہ دنیا میں ہم کس عظیم ابتلاء سے دوچار ہونے والے ہیں۔ اگر ہم اس میں کامیاب ہوگئے تو ہم سا خوش بخت کوئی نہ ہوگا اور اگر پکڑے گئے تو باوجود دنیا کی ساری خوشحالیوں اور ترقیوں کے — ہم سے زیادہ بدبخت اور ناکام و نامراد کوئی نہ ہوگا — کیسے ہیں وہ لوگ جو دنیا کے چھوٹے چھوٹے مقدموں کے لیے زور و پیسہ، وقت، محنت سب کچھ صرف کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں مگر اس سب سے بڑے مقدمہ کی تیاری کے لیے جس پر ابدی راحت و عزت اور دائمی ذلت و خسران کا انحصار ہے ان کے پاس کوئی وقت نہیں! فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ!

فصل ۸

سلف صالحین اور خوفِ آخرت

خود سید البشر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حال یہ تھا کہ نماز میں آخرت سے متعلق آیات پڑھتے تو رو رو کر ہچکیاں بندھ جاتیں، اس گریہ وزاری کا یہ اثر آپ کی صحت پر پڑا۔ صحابہؓ نے عرض کی "یارسول اللہ! آپ پر بڑھاپا آ گیا" آپ نے ان سورتوں کا نام لیتے ہوئے جن میں خاص طور پر عذابِ آخرت کا بیان آیا ہے، فرمایا۔ "مجھے سورۂ ہود، سورۂ واقعہ، سورۂ مرسلات، سورۂ عم یتساءلون اور سورۂ تکویر نے بوڑھا کر دیا ہے۔" (ترمذی)

حضورؐ کے بعد صحابہؓ امت کے گل سر سبد ہیں۔ کون ہے جو خدا اور رسولؐ کے نزدیک ان کے مقام سے ناواقف ہے، ان میں سے بعض وہ تھے جنھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی زندگی ہی میں جنت کی بشارت دی تھی مگر اس کے باوجود وہ قیامت کے دہشت ناک عذاب کے ڈر سے زندگی بھر بے چین و مضطرب رہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ پر اس خوف کا اتنا غلبہ تھا کہ ایک دفعہ ایک چڑیا کو درخت پر بیٹھے ہوئے دیکھا

تو اس کو خطاب کر کے کہنے لگے۔

"واہ! اے چڑیا! تو کتنی خوش نصیب ہے، اے کاش! میں بھی تیرے جیسا ہوتا، تُو درخت پر بیٹھتی ہے۔ پھل کھاتی ہے اور پھر اڑ جاتی ہے، تجھ سے نہ کوئی حساب ہے اور نہ کتاب۔ آہ! اے کاش میں ایک سر رہگزرِ عام ایک درخت ہوتا۔ اونٹ وہاں سے گزرتا، مجھ کو پکڑتا، اپنا منہ مجھ میں مارتا، مجھ کو چباتا، اور اس طرح میری تحقیر کرتا اور پھر مینگنی کی شکل میں مجھ کو خارج کر دیتا، یہ سب کچھ ہوتا مگر میں بشر نہ ہوتا۔" (کنز العمال)

حضرت عمر فاروقؓ جیسے صاحبِ جبروت، جن کا نام سن کر قیصر و کسریٰ تک پر رعب طاری ہو جاتا تھا، دنیا سے رخصت ہونے لگے تو صحیح بخاری کی روایت ہے کہ وہ یہ فرما رہے تھے۔

"اللہ کی قسم! اگر میرے پاس زمین بھر سونا ہو تو میں اللہ کے عذاب کو دیکھنے سے پہلے اس سب کو فدیہ میں دے ڈالوں اور اپنی جان چھڑا لوں۔"

یہی امیر المومنین عمرؓ ایک دفعہ اپنی رعایا میں سے ایک مفلس عورت کے لیے سامانِ خورد و نوش لے کر جا رہے تھے۔ غلام نے عرض کی! امیر المومنین میرے ہوتے یہ بوجھ کیوں اٹھاتے ہیں، میں جو اس خدمت کے لیے حاضر ہوں۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا۔

"تم آج تو میرا بوجھ اٹھا لو گے مگر قیامت کے دن میرا بوجھ کون اٹھائے گا؟"

ضرار اسدی کہتے ہیں کہ میں مختلف لڑائیوں میں حضرت علیؓ کے ساتھ تھا۔ میں نے دیکھا کہ جب آخری شب ستارے ڈوبنے کو ہوتے حضرت علیؓ اٹھتے۔ اپنی داڑھی کو پکڑ کر اس طرح بے چینی کا اظہار کرتے جیسے انھیں کسی سانپ نے ڈس لیا ہو۔ گریہ و زاری کرتے اور ساتھ ساتھ کہتے جاتے۔

"اے دنیا! مجھ کو دھوکا نہ دے، دوسروں کو دے! میرے پیچھے کیوں پڑی ہے۔ میں تجھ کو تین طلاقیں دے چکا ہوں جنھیں میں کبھی واپس نہیں لے سکتا، اے دنیا! تیری عمر بہت ہی کم اور تیرے پیچھے پڑنا بہت ہی چھوٹی سی بات ہے، آہ! توشہ کم ہے اور ایک طویل سفر درپیش ہے۔"

تابعین میں امام ابو حنیفہ کا جو مرتبہ ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ آج بھی کروڑوں مسلمان فقہ میں ان کی پیروی کرتے ہیں، ان کی حالت یہ تھی کہ یزید بن کمیت فرماتے ہیں ایک دفعہ میں نمازِ عشاء میں آپ کے ساتھ شریک تھا۔ امام نے "اذا زلزلت" سورہ کی تلاوت کی، لوگ نماز پڑھ کر چلے گئے لیکن امام اعظمؒ بیٹھ گئے۔ میں نے دیکھا کہ وہ ٹھنڈی آہیں بھر رہے ہیں۔ میں اس خیال سے اٹھ کر چلا گیا کہ حضرت امام کی عبادت میں خلل اندازی کا باعث نہ ہوں۔ علی الصباح پھر مسجد میں آیا تو دیکھا، آپ اسی طرح غمزدہ بیٹھے ہیں۔ ڈاڑھی ہاتھ میں ہے اور بڑی رقت کے ساتھ رو رو کر کہہ رہے ہیں۔

"اے وہ ذات! جو ذرہ بھر نیکی اور ذرہ بھر بدی کا بدلہ دے گی، اپنے غلام نعمان (ابو حنیفہ) کو آگ سے بچا لیجیو۔" (سیرتِ نعمان)

یزید بن خوشب کا قول ہے کہ میں نے حسن بصریؒ اور عمر بن عبدالعزیزؒ سے زیادہ کسی شخص کو قیامت سے ڈرنے والا نہیں دیکھا۔ گویا دوزخ صرف ان ہی دونوں کے لیے پیدا کی گئی۔ (سیرتِ عمر بن عبدالعزیز)

دیکھا آپ نے! وہ ہستیاں جن کے دم قدم سے ظلمت کدۂ عالم میں اجالا ہوا، آخرت کی جواب دہی کے متعلق کتنی حساس اور پریشان تھیں۔ سوچا جائے تو یہی خوفِ آخرت تھا جو ان کی عظمت و برتری کا اصل سبب تھا، وہ جس حیثیت سے رہے، جہاں رہے انھوں نے یہ محسوس کیا کہ ہم سے ہمارے ایک ایک قول اور فعل کا حساب لیا جائے گا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ خدا و خلق کے معاملات سے متعلق جو ذمہ دارانہ روش انھوں نے

اختیار کی، دنیا اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ وہ مسندِ اقتدار پر بیٹھے تو انھوں نے اپنے فرائض کی ادائیگی میں رات دن ایک کردیا اور بوریا نشین ہوئے تو مخلوقِ خدا سے ہمدردی کی بہترین مثال قائم کردی، جو امن و سکون اور مسرت و اطمینان ان کے عہد میں پایا جاتا تھا، ترقی کے اس دور میں انسانوں کو اس کا عشرِ عشیر بھی میسر نہیں۔

سوچا تو آپ نے بھی ہوگا۔ یہ آج دلوں سے سکون کیوں رخصت ہو گیا ہے۔ دنیا امن اور چین کو کیوں ترس گئی ہے اور اتنی ایجادات اور علوم و فنون کی اتنی اشاعت کے باوجود آدمی، بھیڑ کے بھیس میں بھیڑیا کیوں بنتا جا رہا ہے؟ شاید آپ مجھ سے اتفاق کریں کہ اس کی سب سے بڑی اور بنیادی وجہ ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ لوگ یومِ آخرت کو بھول چکے ہیں اور اس کی ہولناکیاں ان کے ذہن سے محو ہو چکی ہیں۔

جنگِ عالمگیر ہوئی تو ہمہ گیر تباہی و بربادی نے قوموں کی آنکھیں کھول دیں، ۱۹۲۰ء میں لیگ آف نیشنز قائم کی گئی اسے دنیا بھر میں قیامِ امن کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا اس پر سالانہ دس لاکھ پونڈ سے زیادہ خرچ کیا گیا۔ مگر نتیجہ ڈھاک کے تین پات رہا۔ اور اب کے اسی مجلس کی ارکان قوموں نے باہم گر جنگ لڑی جو پہلی جنگ سے بھی کئی سو گنا زیادہ مہلک اور بھیانک تھی اور یوں لیگ آف نیشنز کا خاتمہ ہو گیا۔ جنگِ عظیم کے بعد ۵۹ قوموں نے مل کر پھر سے "یونائیٹڈ نیشنز" کے نام سے ایک اور تنظیم قائم کی اس کے لیے عالی شان دفاتر قائم کیے گئے مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد دنیا کو اندازہ ہو گیا کہ یہ تنظیم بھی ہمارے دکھوں کی دوا نہیں بن سکتی چنانچہ آج پھر — دنیا تیسری جنگ کے نعروں سے گونج رہی ہے۔

کاش! انسانیت کو کوئی بتا سکتا کہ اس کے غموں کا مداوا لیگ آف نیشنز کے پاس ہے نہ یونائیٹڈ نیشنز کے پاس۔ اس کی ساری مصیبتوں کا واحد علاج یہ ہے کہ پوری دنیا میں قرآنی تعلیمات کے مطابق وحدتِ آدم کی بنیاد پر ایک عادلانہ اور منصفانہ نظام قائم ہو، ایمان راسخ کیے ذریعے سے دلوں میں خوفِ آخرت پیدا کیا جائے۔ یہ چیز حاصل ہو گئی تو دنیا امن و راحت کا گہوارہ بن جائے گی۔

فصل ۹

دنیا اور آخرت میں باہمی تعلّق

دنیا و آخرت کے باہمی تعلّق کے بارے میں ہمارا نقطۂ نظر کیا ہونا چاہیے۔

لوگ انسانی زندگی کے بعض دوسرے مسائل کی طرح اس اہم معاملہ میں بھی افراط و تفریط کا شکار ہیں۔

کچھ وہ ہیں جو دنیا اور متاعِ دنیا کو نجس و ناپاک سمجھ کر اس سے کنارہ کشی اختیار کرنا ضروری سمجھتے ہیں ان کے نزدیک اُخروی نجات کا واحد راستہ ہی یہ ہے کہ آدمی لذائذِ دنیا کا تارک ہو جائے اور کچھ وہ ہیں جو اسلام اور دنیا داری کو ہم معنی قرار دیتے، دنیا پرستی کی سرحد پر آن پہنچے ہیں۔

بنظرِ انصاف دیکھا جائے تو یہ دونوں زاویہ ہائے نگاہ "دنیا و آخرت" سے متعلق اسلامی نظریہ کی صحیح ترجمانی نہیں کرتے۔

اگر کاروبارِ دنیا سے روگردانی ضروری ہوتی اور انسانی زندگی کے سارے مشاغل

شیطانی ہوتے تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کبھی مسلمانوں پر کسبِ معاش کو فرض قرار نہ دیتے۔ مشہور حدیث ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا، طلب الحلال فریضۃ بعد الفریضۃ فرائضِ اسلامی کی بجا آوری کے بعد رزقِ حلال کی طلب و جستجو فرض ہے۔ سنت اور واجب بھی نہیں کہا، رزقِ حلال کے حصول کی کوششوں کو فرض قرار دیا، ایک اور جگہ فرمایا۔ افضل الاعمال الکسب من الحلال نیک اعمال میں سے سب سے زیادہ اچھی نیکی حلال روزی کمانا ہے۔" غور کیجیے، بات "فرض" ہونے سے بھی کچھ اور آگے چلی گئی۔ رزقِ حلال کے لیے کوشاں ہونا دوسرے تمام اعمال سے زیادہ اہم بنا دیا گیا۔ تاجر سے زیادہ دنیا دار کون ہوگا کہ اسے رات دن روپے پیسے سے واسطہ رہتا ہے لیکن ذرا غور سے سنیے دنیا کے سب سے بڑے زاہد اور عابد کا ارشاد ہے التاجر الصدوق الامین مع النبیین والصدیقین والشہداء سچا اور امانت دار تاجر (قیامت کے دن) انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔

یہ ٹھیک ہے کہ دینی ذوق رکھنے والے بزرگوں کے نزدیک لذائذِ دنیا کو ترک کیے بغیر مراتبِ عالیہ حاصل نہیں ہوتے مگر جب ہم بعض مشہور زہاد کی خوش پوشاکی اور خوش خوراکی دیکھتے ہیں تو اول الذکر حضرات کا یہ رجحان ان کے اپنے ذاتی ذوق کی تخلیق نظر آتا ہے۔ امام نسائیؒ جن کی ریاضت و عبادت زبان زدِ خاص و عام تھی کے متعلق ذہبی نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ۔

"وہ کھانے میں زیادہ تر بڑے قد والے مرغ کو پسند کرتے تھے، جو خاص کر ان کے لیے خریدے جاتے تھے اور ان کو خصی کر کے خوب فربہ کر لیا جاتا تھا۔"

خواجہ حسن بصری جن کی ولایت اور خدا خوفی کا ہر چہار طرف چرچا تھا لطیف غذاؤں کے اتنے شوقین تھے کہ ان کے متعلق طبقاتِ ابنِ سعد میں ہے۔

"حسن بصری کے شوربے سے زیادہ خوشگوار خوشبو میں نے کسی دوسرے آدمی کے شوربے

میں نہیں دیکھی۔"

حضرت امام مالکؒ کے متعلق آتا ہے کہ ۔

"آپ ہمیشہ قیمتی لباس زیب تن فرماتے اور عطر اور خوشبو میں ڈوبے رہتے۔ آپ گوشت کے بغیر کھانا تناول نہیں فرماتے تھے اور اپنے اس ذوق پر اتنے قائم تھے کہ کسی دن اگر گوشت کے لیے پیسے نہ ہوتے تو اس کے لیے گھر کی کوئی چیز بیچنی پڑتی تو اس سے بھی دریغ نہ کرتے تھے۔" (الدیباج المذہب ص ۱۹)

ان چند مثالوں سے یہ بات واضح ہو جانی چاہیے کہ آخرت پر ایمان لانے کا مطلب کسی صورت میں بھی ترکِ دنیا نہیں ہو سکتا۔ البتہ احتیاط و اعتدال شرط ہے۔ مثلاً قرآن میں ہے۔

"اے پیغمبر آپ ان لوگوں کو بتلا دیجیے کہ دنیا کا سرمایہ تو بہت ہی قلیل ہے، اور آخرت بہتر ہے پرہیزگاروں کے لیے۔" (النساء ع - ۱۱)

مزید فرمایا

"یہ دنیا کی زندگی تو بس چند روزہ استعمال کے لیے ہے اور آخرت ہی اصل رہنے کی جگہ ہے۔" (المومن ع - ۵)

ایک اور جگہ ارشاد ہوا۔

"اور دنیا کی زندگانی کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ بس کھیل تماشا ہے اور آخرت کا گھر ہی بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو پرہیزگاری کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں۔" (الانعام ع - ۴)

اسی مفہوم کی ایک حدیث کے الفاظ ہیں۔

"حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کہ بندۂ دینار خدا کی رحمت سے محروم ہوا اور بندۂ درہم خدا کی رحمت سے

دور رہے۔" (ترمذی)

ایک اور حدیث میں کعب بن عیاض سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپؐ ارشاد فرماتے تھے کہ ہر امت کے لیے کوئی خاص آزمائش ہوتی ہے اور میری امت کی خاص آزمائش مال ہے۔" (ترمذی)

بخاری اور مسلم میں حضرت عمرو بن عوفؓ سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تم پر فقر و ناداری آنے سے نہیں ڈرتا، لیکن مجھے تمھارے بارے میں یہ ڈر ضرور ہے کہ دنیا تم پر زیادہ وسیع کردی جائے، جیسے کہ تم سے پہلے لوگوں پر وسیع کی گئی تھی، پھر تم اس بات کو بہت زیادہ چاہنے لگو، جیسے کہ انھوں نے اس کو بہت زیادہ چاہا تھا (اور اس کے دیوانے اور متوالے ہو گئے تھے) اور پھر وہ تم کو برباد کردے جیسے کہ اس نے اگلوں کو برباد کیا۔"

ان چند حوالوں سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی کہ جہاں اسلام نے کسب حلال کو بڑی فضیلت دی ہے وہاں مادّہ پرستی اور حرص دنیا کو بھی ملعون و مبغوض ٹھہرایا ہے وہ نہیں چاہتا کہ اس کے ماننے والے بندۂ درہم و دینار بن کر رہ جائیں اور ان پر روپے پیسے کی محبت اتنی غالب آجائے کہ وہ آخرت کو پسِ پشت ڈال دیں۔

بادی النظر میں یہ دونوں قسم کے حوالہ جات باہمدگر متناقض نظر آتے ہیں لیکن غور کیا جائے تو آدمی ان سے بآسانی اس نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے کہ اسلام دنیا داری سے نہیں روکتا (بلکہ امورِ دنیا کو احسن طریقہ پر انجام دینے کی تلقین کرتا ہے) مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ اس کی بھی اجازت نہیں دیتا کہ انسان ہر جائز و ناجائز ذریعے سے "زراندوزی" پر کمر باندھ لے، اس کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اگر آپ اس کی بتائی ہوئی حدود میں رہ کر دنیا کے

کام کرتے ہیں تو وہ عینِ دین بن جاتے ہیں اور اُن سے رُوگردانی کرتے ہیں تو آپ "اخوان الشیاطین" کی صف میں کھڑے ہونے کے لائق ہیں۔

پس نقطۂ اعتدال یہ ہے کہ آپ جائز اور حلال رستوں سے دنیا کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوں، ان کے حصول کے لیے کوشاں ہوں لیکن ان کی محبت میں اتنے سرمست نہ ہو جائیں کہ آپ کے دل سے آخرت کا خیال ہی نکل جائے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کتنی پتے کی بات فرما گئے ہیں۔

"دنیا ہاتھ میں رکھنے کی چیز ہے، جیب میں رکھنے کی چیز ہے لیکن دل میں رکھنے کی چیز نہیں۔"

کتابیات

اس سلسلۂ مضامین کی ترتیب میں یوں تو میں نے بے شمار کتابوں سے استفادہ کیا ہے، لیکن اصلاً جو کتابیں اس سلسلے میں میری رہنما رہی ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ مکتوبات	حضرت مجددِ الفِ ثانیؒ
۲۔ حجۃ اللہ البالغہ (جلد اول)	شاہ ولی اللہ دہلویؒ
۳۔ کیمیائے سعادت	امام غزالیؒ
۴۔ تفسیرِ حقانی	مولانا عبد الحق حقانیؒ
۵۔ تفہیم القرآن	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی
۶۔ تفسیرِ ماجدی	مولانا عبد الماجد دریابادی
۷۔ ترجمان السنۃ (اول، دوم، سوم)	مولانا بدرِ عالم میرٹھی
۸۔ انتباہات المفیدہ	مولانا اشرف علی تھانویؒ
۹۔ الکلام	مولانا شبلی نعمانیؒ
۱۰۔ الکلام	مولانا ادریس کاندھلوی
۱۱۔ اسلامی تہذیب کے اصول و مبادی	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی
۱۲۔ اسرارِ خودی، رموزِ بے خودی	اقبالؒ

وہ ۲۱ اپریل ۱۹۳۴ء کو پیدا ہوئے۔ ابھی ان کی عمر ۳۸ سال ہے مگر اڑتیس سال کی اس عمر میں انھوں نے صدیوں پر محیط طویل مسافتیں بھی طے کر لی ہیں اور ایک لمبی جدّوجہد کے ماحصل کو بھی سینے سے لگا لیا ہے۔

وہ ابھی نوعمر طالب علم تھے کہ انھیں زندگی کی سخت ترین اُلجھنوں اور کشاکشوں سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ مگر قدرت نے انھیں صبرِ ایوب اور حوصلہ سکندر سے نوازا تھا۔ وہ اپنے راستے کی مشکلات پر ہمیشہ ہنسے۔ انھوں نے اندھیروں کو آنے والی روشنی کے تصور سے ہمیشہ خوش آمدید کہا۔

ان کا یہ ثبات اور اپنے اُوپر بھروسہ، ہمیشہ ان کے کام آیا۔ اِسی کے طفیل وہ طالب علمی کے عہد میں، اپنے ساتھی طالب علموں کے رہنما بھی بنے اور جب تعلیم سے فراغت کے بعد عملی زندگی اور عوامی جدّوجہد میں شامل ہوئے تو یہاں بھی انھیں میرِ کارواں کے کندھے سے کندھا ملا کر آگے بڑھنے کا شرف نصیب ہُوا۔

وہ عوام میں سے اُوپر کو اُٹھے ہیں اور ہر لحظہ انھیں یہ بات یاد رہتی ہے۔ آج جبکہ وہ عوامی حکومت کے ایک ذمّہ دار اور پُروقار وزیر ہیں، انھیں وہ دن بالکل نہیں بھُولے ہیں جبکہ کلمۂ حق کو سربلند رکھنے کے لیے ایک نواب زادے نے اُن کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں پہنائی تھیں۔

۱۹۷۰ء کے عوامی انتخابات میں جبکہ سیالکوٹ کے ستانوے ہزار لوگوں نے انھیں قومی اسمبلی کے لیے اپنا نمائندہ چنا تھا، تو انھیں ۵۱-۵۲ء کی وہ ساری تنہائیاں اچھی طرح یاد تھیں جو لاہور کے بھرے بازاروں اور گنجان محلّوں نے ان کی جھولی میں اس وقت ڈالی تھیں جبکہ وہ نئے نئے اس شہر میں آئے تھے۔

ان کا ماضی انھیں ہمیشہ آئینہ دِکھاتا ہے اور وہ اپنا چہرہ اس میں دیکھ کر بالکل نہیں شرماتے۔

وہ پنجاب کے پہلے اخبار نویس ہیں جنھوں نے "شہاب" کے ذریعے پنجاب کے ہفتہ وار اخبارات کی تاریخ میں کثرتِ اشاعت کے جو ریکارڈ قائم کیے تھے اسے آج تک کوئی توڑ نہیں سکا ہے۔

وہ پنجاب کے وہ شعلہ بیان خطیب ہیں جن کی زبان بھی شعلے اُگلتی رہی ہے اور قلم بھی روشنیاں بکھیرتا رہا ہے۔ مگر لطف کی بات یہ ہے کہ اُن کی زبان و قلم سے نکلتے شعلے عوام کے لیے تو خوشبو کا مزاج رکھتے تھے مگر استحصالی نظام کے لیے ان کی تپش جلتے انگاروں سے کسی طرح کم نہ تھی۔

وہ پہلے بھی مُجاہد تھے اور آج بھی مُجاہد ہیں۔ جہاد ہی ان کی زندگی کا نُقطۂ سفر تھا اور جہاد ہی ان کا منتہا اور منزلِ مقصود ہے۔

اِیمان افروز کتابیں

مولٰینا کوثر نیازی کے قلم سے

اِسلام ہمارا دین

یہ تصنیف مولٰینا کوثر نیازی کے اُن قلبی احساسات و جذبات کی ترجمان ہے جو مولٰینا کے دِل میں اِسلام کی ہمہ گیری و جہانداری کے باب میں اُس وقت سے پرورش پاتے رہے ہیں جبکہ ابھی وہ طالب علم تھے۔

اِس میں کوئی کلام نہیں کہ مولٰینا کا قلم عقیدت کی روشنائی میں ڈوب ڈوب کر اُبھرا ہے مگر انھوں نے اپنے ہر مضمون میں بات وہی کہی ہے جس کی گواہی تاریخ نے دی ہے۔ سائز $\frac{18 \times 23}{8}$ صفحات 362 قیمت 14.50

بصیرت

مولٰینا کوثر نیازی نے اپنی اس تالیف میں کلام اللہ کی ایسی آیات کا انتخاب کیا ہے جو ہماری روزمرّہ زندگی سے براہِ راست رابطہ رکھتی ہیں۔ آپ نے کوزے میں دریا بند کرنے کا اسلوب اپنایا ہے اور اِن آیات کی تشریحیں ایک ایک دو دو صفحوں میں سمیٹ لی ہیں جنھیں بیان کرنے کے لیے مفسّرین نے اجزا کے اجزا لکھ ڈالے اور بات پھر بھی تشنہ رہی۔ سائز $\frac{18 \times 23}{8}$ صفحات 250 قیمت 10.50

بُنیادی حقیقتیں

مولٰینا کوثر نیازی اِسلام کے سچّے اور مخلص مبلغ ہیں۔ یہ کتاب لکھ کر انھوں نے اِسلام کی تبلیغ کا حق پوری طرح ادا کر دیا ہے اور اِسلام کے بُنیادی حقائق عوام کے سامنے مختصر الفاظ میں اِس طرح پیش کیے ہیں کہ کوئی تشنگی باقی نہیں رہتی۔ سائز $\frac{18 \times 23}{8}$ صفحات 150 قیمت 6.50

فیروز سنز لمیٹڈ لاہور